اسلام آگے کیوں نہ چلا

نہیں سلیم! یہ سوال کچھ انوکھا تمہارے ہی دل سے نہیں ابھرا جو اس کے زبان تک لانے میں تمہیں اس قدر تردد و تامل ہوتا۔ یہ تو ہر اس شخص کے ذہن میں پیدا ہو گا جو ہمارے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا اور دیکھے گا کہ مسلمان اپنے ابتدائی دور میں اس تیزی کے ساتھ ساری دنیا پر چھا گئے کہ اس کی نظیر تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی۔ اور اس کے بعد وہ اس طرح مائل بہ زوال ہوئے کہ پھر ان کے ابھرنے کی کوئی صورت ہی پیدا نہ ہوئی۔ تاریخ کے اس مطالعہ کے بعد (جو حقائق پر مبنی ہے) اظہار خیال کرنے والوں کے دو گروہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

دو گروہ

ایک گروہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے (اور اس کا اظہار بے باکانہ کرتا ہے) کہ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے عربوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی جس کی بناء پر وہ ایران اور روما کی مملکتوں پر غالب آگئے اور ساری دنیا میں پھیل گئے۔ لیکن اسلام میں اس کی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا۔ اس لئے جب زمانہ آگے بڑھا تو اسلام ناکام رہ گیا اور مسلمانوں کا عروج 'انحطاط' میں بدل گیا اس کے بعد یہ گروہ طنزاً" کہتا ہے کہ اب جب کہ زمانہ اس قدر آگے نکل گیا ہے' اسی ناکام تجربے کے دہرانے کی کوشش کرنا حماقت ہے (Bu.M.Abul Kalam Azad. Freedom - India Wins) دوسرا گروہ اس قدر بے باکی کی جرات تو نہیں کرتا لیکن اس کے دل میں بھی یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام ایک حقیقت ثابتہ تھا اور اس میں فی الواقعہ صلاحیت تھی کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا' تو وہ چند قدم چل کر رک کیوں گیا۔ برابر آگے کیوں نہ بڑھتا گیا؟ یہ خیال ان کے دل میں تعجب اور تشکیک کے

ملے جلے جذبات ابھارتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اسلام کی ابدی صداقت کے متعلق ان کے ایمان میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے۔

گروہ یہ ہو یا وہ' یہ سوال بہرحال ایسا ہے جس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اور جس کا اطمینان بخش جواب' غیروں کے اعتراض کے مسکت جواب اور اپنوں کے شبہات کے ازالہ کا موجب ہو گا۔ اس لئے تم نے اچھا کیا کہ اسے بلاتکلف پوچھ کر یہ موقعہ بہم پہنچا دیا کہ میں اپنی بصیرت قرآنی کے مطابق اس مشکل عقدہ کو وا کرنے کی کوشش کروں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اسلام کسے کہتے ہیں؟

سب سے پہلے تو یہ سمجھو سلیم! کہ اسلام کسے کہتے ہیں؟ تمہیں معلوم ہے کہ اس کائنات میں' خدا کے متعین کردہ' غیر متبدل' محکم اصول (قوانین) کارفرما ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ عظیم و عجیب' اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ کائنات کی ہر شے' ان قوانین خداوندی کے سامنے سرتسلیم خم کئے ہے۔ ولہ اسلم من فی السموت والارض (3/72) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے (قوانین کے سامنے) جھکے ہوئے ہیں وھم لا یستکبرون (16/49) "یہ کبھی ان قوانین سے سرکشی نہیں برتتے۔" اسے (کائناتی اسلام" سمجھو۔ اس کے قوانین' نہ آج تک ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ نہ تھک کر کسی مقام پر رک گئے ہیں۔ یہ برابر آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کا کوئی سقم یا خلفشار نہیں۔ ما تری فی خلق الرحمن من تفرت (67/3) "تخلیق خداوندی میں تم کوئی جھول نہیں پاؤ گے۔"

جس طرح خدا نے سلسلہ کائنات کے لئے غیر متبدل قوانین متعین کئے ہیں' اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی ایسے محکم اصول اور مستقل اقدار (بذریعہ وحی) عطا کئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے افراد اور اقوام' زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے' آگے بڑھتے اور بلند ہوتے چلے جاتے ہیں------ یعنی انہیں' اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں' اور اس کے بعد کی زندگی میں

بھی کامیابیاں اور کامرانیاں -------- لیکن انسان کو چونکہ (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) مجبور پیدا نہیں کیا گیا' اس لئے اسے اس کا اختیار ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان سے انحراف برت کر اپنے خود ساختہ مسلک پر گامزن ہو-------- اول الذکر راستہ اسے عروج و ارتقاء کی طرف لے جائے گا اور ثانی الذکر مسلک' زوال و انحطاط کی طرف--------

حق و باطل کی کشمکش

خدا کا تجویز کردہ نظام زندگی (الدین یا اسلام) تمام نوع انسان کی عالمگیر ربوبیت کی ضمانت دیتا ہے اور زمین کے دسترخوان پر بکھری ہوئی نعمائے خداوندی کو ہر ضرورت مند کے لیے یکساں طور پر کھلا رکھتا ہے۔ لیکن یہ چیز ان لوگوں پر شاق گذرتی ہے جو اپنی قوت کے بل بوتے پر رزق کے سرچشموں پر قابو پا کر دوسروں کو ان سے محروم رکھنے اور اس طرح ان سے اپنی من مانی کرانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس لئے یہ کردہ نظام خداوندی (الاسلام) کی مخالفت کرتا اور اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرتا ہے قرآن کی اصطلاح میں اسے حق و باطل کی کشمکش کہتے ہیں۔ اس سے تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ الاسلام کائنات میں بھی کارفرما ہے اور انسانی دنیا میں بھی -------- اس فرق کے ساتھ کائنات میں اس کی کہیں مخالفت نہیں ہوئی اور انسانوں کی دنیا میں اس کی مزاحمت ہوتی ہے۔

اب آگے بڑھو۔ تمہیں اس کا علم ہے کہ اگر بیج تندرست و توانا (صالح) ہو اور اسے ضروری سامان نشو و نما مل جائے تو اس سے کونپل پھوٹتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ اوپر کو ابھرتی' ایک دن تناور درخت بن جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جائے گا کہ اس بیج میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اوپر کو ابھرے اور اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ جن ابدی قوانین اور مستقل اقدار کا اوپر ذکر کیا گیا ہے (اور جن کے مجموعہ کا نام الاسلام ہے) قرآن کہتا ہے کہ ان میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ وہ تمام موانعات کو اپنے راستے سے ہٹاتے ہوئے اوپر کو ابھریں اور اپنی منزل مقصود تک پہنچ کر رہیں۔ الیہ یصعد الکلم الطیب..... (35/10) "ان خوشگوار نظریات حیات میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ "خدا کی طرف" اوپر کو اٹھتے جائیں۔" یعنی عروج و ارتقاء کی وہ آخری منزل جسے خدا نے

ان کے لئے متعین کیا ہے' اس تک پہنچ کر رہیں۔ دوسرے الفاظ میں حق میں اس کی صلاحیت اور قوت ہے کہ وہ باطل کا مقابلہ کر کے اسے شکست دے اور اس طرح اپنے راستے پر چلتا جائے۔

حق ہمیشہ غالب رہتا ہے

قرآن اس باب میں کہتا ہے **بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا هو زاهق**..... (21/18) "ہم حق کا باطل پر نشانہ لگاتے رہتے ہیں تو حق باطل کا سر توڑ دیتا ہے اور اس طرح باطل شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے۔" باطل راستے سے ہٹ جاتا ہے اور حق پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں چلے جاتا ہے۔

اس مقام پر تمہارے دل میں یقیناً یہ سوال پیدا ہو گا کہ ہمارا مشاہدہ تو اس کے خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں باطل کا دور دورہ ہے۔ وہی ہر جگہ مسلط نظر آتا ہے۔ حق کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ظلم' استبداد' قہرمانیت' بددیانتی' دھوکہ' فریب' دنیا کے بازار میں انہی کا سکہ رواں دواں ہے تو پھر ہم کیسے سمجھ لیں کہ یہاں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے اور اس کشمکش میں حق ہمیشہ باطل پر غالب آتا ہے اور باطل خائب و ناکام میدان چھوڑ جاتا ہے؟ تمہارا یہ شبہ بجا ہے لیکن ایک غلط فہمی پر مبنی۔ اس غلط فہمی کے رفع ہو جانے سے اس شبہ کا ازالہ خود بخود ہو جائے گا۔

اس کی رفتار سست ہوتی ہے

قرآن کہتا ہے کہ خدا کے متعین کردہ تصورات حیات میں اس کی صلاحیت تو موجود ہے کہ وہ (اپنے زور دروں سے) تمام موانعات کو راستے سے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ لیکن ان کی اس طرح آگے بڑھنے کی رفتار (تمہارے اندازوں کے مطابق) بڑی سست ہے۔

سورہ سجدہ میں ہے **یدبر الامر السماء الی الارض**۔ "خدا اپنے امر کی تدبیر سماء سے ارض کی طرف کرتا ہے۔" یعنی خدا اپنی مشیت کے مطابق ایک اسکیم کی تجویز کرتا ہے۔ اس کی یہ تجویز "عالم امر" میں ہوتی ہے جو انتہائی بلندیوں پر ہے۔ لیکن اس اسکیم کو عملی تشکیل دینے کے لیے وہ اس کا آغاز پست ترین سطح سے کرتا ہے جیسے وہ بیج جس میں

شاہ بلوط کا تناور درخت بننے کی صلاحیت ہوتی ہے' پہلے مٹی میں دبایا جاتا ہے۔ اس مقام سے اس شاہ بلوط کی نمود کی ابتداء ہوتی ہے۔ ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنتہ مما تعدون۔ (32/5) "پھر وہ اسکیم اس کی طرف اٹھتی ہے ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے حساب و شمار کے مطابق' ہزار برس کی ہوتی ہے۔" یعنی خدا کی ہر اسکیم (جو حق پر مبنی ہوتی ہے) اپنے نقطہ تکمیل تک پہنچ کر رہتی ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کہ وہ راستے کے موانعات سے مغلوب ہو کر ناکام یا ناتمام رہ جائے۔ لیکن اس کی ترقی کی یہ رفتار بڑی ست ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ (بظاہر) آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ یہ تو پھر بھی مجرد حقائق (Abstract Truths) کی بات ہے۔ نمود و ارتقاء کی رفتار تو محسوس' مادی اشیاء میں بھی اس غیر مرئی (Invisible) اور غیر محسوس (Imperceptible) ہوتی ہے کہ آنکھ اس کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ علم الارتقاء (Evolution Organic) کے ماہرین بتاتے ہیں کہ کسی ایک نوع (Species) میں ذرا سی تبدیلی کے لیے لاکھوں برس کی مدت درکار ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک نوع لاکھ برس تک اسی حالت میں رہتی ہے اور پھر اس میں یک لخت تبدیلی ہو جاتی ہے۔ نہیں۔ اس میں یہ تبدیلی بتدریج ہو رہی ہوتی ہے لیکن اس کی رفتار ایسی غیر محسوس ہوتی ہے کہ اس تبدیلی کا احساس تک بھی نہیں ہو سکتا۔ کہیں لاکھوں برس میں جا کر' وہ تبدیلی مشہود شکل میں سامنے آتی ہے۔ یہ ہے "خدائی اسکیم" کی وہ رفتار جس کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس کا (اور قرآن کے دوسرے مقام کے مطابق' پچاس پچاس ہزار برس کا) ہوتا ہے۔ تم اس ست روی کا اندازہ کرنا چاہو تو کسی پودے کے پاس بیٹھ جاؤ۔ ہفتوں' مہینوں' برسوں' دن رات اس کے پاس رہو۔ وہ اس دوران میں مسلسل آگے بڑھ رہا ہو گا۔ لیکن تمہیں اس کا احساس تک بھی نہ ہونے پائے گا کہ اس میں کوئی تبدیلی واقع ہو رہی ہے------ لو! مجھے یاد آ گیا۔ پچھلے سال جب تم یہاں تھے تو تمہاری گھڑی کی منٹوں کی سوئی گر گئی تھی اور صرف گھنٹوں کی سوئی رہ گئی تھی۔ دن بھر گھڑی تمہارے سامنے رہتی تھی۔ گھنٹوں کی سوئی ایک سے دو' دو سے تین' تین سے چار تک پہنچ جاتی تھی لیکن تمہیں احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ گھڑی چل رہی ہے۔

غلبہ حق کا ہوتا ہے

حق و باطل کی کشمکش میں حق کا غلبہ اور باطل کی شکست' اس آہستہ خرامی سے ہوتی ہے جس میں ایک ایک دن کی مدت ہمارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔ ہم تاریخ کے کسی ایک دور کو لیتے ہیں (جو دس بیس برس پر مشتمل ہوتا ہے) اور دیکھتے ہیں کہ اس میں باطل کا دور دورہ ہے۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ غلبہ باطل ہی کا رہتا ہے۔ اگر ہم ہزار سال کی تاریخ کا وقت نظر سے مطالعہ کریں تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جائے گی کہ جہاں اور جب خدا کے متعین کردہ کسی اصول کے ساتھ انسانوں کے خودساختہ نظام کا ٹکراؤ ہوا ہے' آخر الامر' غلبہ خدائی اصول کو ہوا ہے اور انسانی نظام ناکام رہا ہے۔ (اس کی مثالیں ذرا آگے چل کر تمہارے سامنے آئیں گی)

چونکہ مسئلہ ذرا مشکل اور بات دقیق ہے' اس لئے میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ اس وقت تک کہا جا چکا ہے اسے مختصر الفاظ میں دہرا دوں۔ میں نے کہا یہ کہ

(۱) اسلام ان غیر متبدل' اصولوں کا مجموعہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے (بذریعہ وحی) عطا کیا ہے تاکہ اس کے مطابق زندگی بسر کر کے کاروان انسانیت اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔

(۲) مفاد پرست گروہ' اس ضابطہ خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں اور اس طرح حق اور باطل میں کشمکش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

(۳) حق میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ وہ باطل کو شکست دے کر اپنی منزل کی طرف بڑھتا جائے۔ لیکن

(۴) اس کی رفتار اتنی سست ہوتی ہے اس کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

اس کی رفتار تیز کی جا سکتی ہے

لیکن اس کے ساتھ قرآن کچھ اور بھی کہتا ہے اور وہ اس سلسلہ کی بڑی اہم کڑی

ہے۔ سورہ فاطر کی جو آیت پہلے درج کی جا چکی ہے اس کا اگلا حصہ یوں ہے الیہ یصعد الکلم الطیب۔ والعمل الصالح یرفعہ (35/10) "خوشگوار نظریات زندگی میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے نصب العین کی طرف بلند ہوتے جائیں۔ لیکن اگر ان کے ساتھ' انسان کے اعمال صالح کی تائید بھی شامل ہو جائے تو اس سے انہیں مزید ارتفاع (بلندی) حاصل ہوتی ہے۔ اس سے سلیم! بات صاف ہو گئی۔ یعنی قوانین خداوندی' اپنی عام (ست) رفتار سے خودبخود چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ انسانوں کی جماعت انہیں اپنے ہاں عملاً نافذ کر کے معاشرہ کو ان کے خطوط پر مستقل کر لے' تو ان کی رفتار بڑی تیز ہو جاتی ہے اور ان کے جو نتائج ہزار ہزار برس میں جا کر ظہور آنے تھے' وہ دنوں کے اندر سامنے آ جاتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ عام حالات میں' انسانی معاشرہ میں تبدیلیاں ارتقائی طور پر (By Evolution) نمودار ہوتی ہے لیکن انسانی جماعت کی رفاقت سے یہ تبدیلیاں' انقلابی طور پر (By Revolution) ظہور آ جاتی ہے۔ یا علم الارتقاء کی اصطلاح میں' یہ تبدیلیاں فجائی ارتقاء سے (By Emergent Evolution) نمودار ہو جاتی ہے۔

اس ضمن میں ایک اور نقطہ بھی سمجھنے کے قابل ہے۔ جب خدا کے ابدی حقائق اپنی عام رفتار سے جادہ پیما ہوتے ہیں ذہن انسانی عام طور پر انہیں اپناتا جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک تبدیلی نے ہزار برس میں جا کر نمودار ہونا ہے تو اس طویل مدت میں' ذہن انسانی کی سطح بھی اتنی اونچی ہو جاتی ہے کہ وہ اس بلند تصور کو اپنا سکے۔ لیکن جب کسی خاص جماعت کے اعمال صالح سے یہ حقائق غیر معمولی رفتار سے آگے بڑھ جائیں تو اس جماعت سے باہر کے انسانوں کی ذہنی سطح اتنی اونچی نہیں ہوتی کہ وہ ان حقائق کے ہم دوش ہو جائے۔ اس لئے وہ حقائق ان انسانوں کے لئے غیر مانوس رہتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم کسی بچے کی تعلیم کا سلسلہ جاری کریں اور اسے بتدریج آگے بڑھاتے چلے جائیں تو وہ ایک دن نہایت آسانی سے ایم۔ اے کے مشکل ترین اسباق کو سمجھ لے گا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں ہو گا کہ اس کے سامنے کوئی مشکل سوال آ گیا ہے لیکن اگر دسویں جماعت میں ایم۔ اے کا کورس اس کے سامنے رکھ دیا جائے تو اس کا ذہن اسے اپنے لیے غیر مانوس پائے گا۔ اگر

ہم چاہیں کہ اسے دس سال میں ایم۔ اے تک پہنچائیں تو شروع ہی سے اس کی تعلیمی رفتار کو (اسی نسبت سے) تیز تر کرنا ہو گا جس کے لئے خاص انتظامات و اہتمامات کی ضرورت ہو گی۔

انسانی عقل کا طریق

انسانی عقل کا طریق تجرباتی ہے وہ (Trial And Error) سے کسی نتیجہ تک پہنچتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے۔ پھر اس پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ سینکڑوں برس کے تجربات کے بعد جا کر معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریہ نے صحیح نتائج پیدا نہیں کیے۔ اس طرح جب وہ نظریہ غلط ہوتا ہے تو عقل انسانی دوسرا نظریہ وضع کرتی ہے۔ اس طرح پیہم تجربات کے بعد کہیں صدیوں میں جا کر وہ صحیح نظریہ تک پہنچتی ہے۔ اس وقت یہ نظریہ اس کے لیے غیر مانوس نہیں ہوتا۔ اس تمام دوران میں ذہن اسے اپنا چکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وحی خداوندی کی رو سے صحیح نظریات زندگی بیک وقت انسانوں کے پاس آ جاتے ہیں۔ اس لیے انسانی ذہن کو ان سے مانوس کرنے کے لیے خاص کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

(اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی)

ظہور اسلام

اس طویل تمہید کے بعد سلیم! تم اصل سوال کی طرف آؤ خدا کے ابدی قوانین (الاسلام) اپنی معمولی رفتار سے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ جس حد تک ذہن انسانی انہیں اپنا چکا تھا۔ وہ اس حد تک ان سے مانوس تھا۔ ان کا باقی حصہ ہنوز اس کی دسترس سے باہر تھا کہ اتنے میں سرزمین عرب میں نبی اکرمؐ کا ظہور قدسی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ابدی قوانین (الاسلام) کا مجموعہ بذریعہ وحی حضورؐ کو عطا فرمایا ان قوانین کا حصہ ہنوز ذہن انسانی کی دسترس سے باہر تھا' حضورؐ کے مخاطبین نے اسے اپنے لیے غیر مانوس پایا اور اس کی مخالفت شروع کر دی۔ آپؐ نے اپنی بے مثال تعلیم اور بے مثال عمل سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ حقائق کس طرح شرف انسانیت کے ضامن اور ان کی فلاح و

بہبود کے کفیل ہیں۔ جن سعید روحوں نے اپنے تعصب کو ایک طرف رکھ کر' انہیں سمجھنے کی کوشش کی' ان کی سمجھ میں بات آ گئی اور وہ حضورؐ سے متفق ہو گئے۔ اس طرح مومنین کی جماعت حضورؐ کے گرد جمع ہوتی چلی گئی۔ اس جماعت کے اعمال صالح (تعمیری پروگرام) نے خدا کے ابدی حقائق کی رفتار میں تعجب انگیز تیزی پیدا کر دی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان سے ایسے محیرالعقول نتائج مرتب ہو کر سامنے آئے کہ تاریخ کے اوراق میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ کچھ کسی مافوق الفطرت یا غیر معمولی اسباب کی رو سے ظہور میں نہیں آیا تھا۔ یہ خدا کے اسی ابدی قانون کے مطابق ہوا تھا جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ **الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ** خوشگوار نظریات حیات اپنے زور دروں سے اس کی طرف اٹھتے چلے جاتے ہیں اور (انسانوں کے) اعمال صالح انہیں ترفع (بلندی) عطا کر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس جماعت کے اعمال صالح کی رو سے ہوا تھا جنہوں نے ان قوانین کی رفتار میں ایسی غیر معمولی تیزی پیدا کر دی تھی کہ ان کے جو نتائج کہیں ہزار برس میں جا کر محسوس طور پر سامنے آئے تھے' چند دنوں میں مشہور ہو گئے۔

اگر یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہتا تو یہ حقائق اسی تیز رفتاری سے آگے بڑھتے چلے جاتے (اور سوچو سلیم! کہ اس طرح انسان اس وقت تک کہاں پہنچا ہوتا؟) لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ انسانی جماعت کے اعمال صالح ان حقائق کے ساتھ نہ رہے۔ لہٰذا ان حقائق نے پھر اپنی سابقہ (معمولی) رفتار سے چلنا شروع کر دیا۔ یہ تھوڑا سا زمانہ جس میں ان حقائق کے نتائج انسانی حساب و شمار کے مطابق سامنے آ گئے تھے' وہ زمانہ ہے جس کے متعلق دنیا کے مورخین اور مفکرین یہ کہتے ہیں اسلام صرف اس وقت تک کامیاب رہا۔ اس کے بعد ناکام ہو گیا۔ حالانکہ جو کچھ فی الحقیقت ہوا وہ صرف اس قدر ہے کہ اسلام اپنی معمولی رفتار (ہزار ہزار برس کے ایک ایک دن) چلا آ رہا تھا۔ درمیان میں اسے خارجی قوت مل گئی جس سے اس کی رفتار میں غیر معمولی تیزی پیدا ہو گئی۔ بعد میں وہ خارجی قوت الگ ہو گئی اور اسلام پھر اپنی سابقہ رفتار سے چلنے لگ گیا۔ بالفاظ دیگر نہر اپنی معمولی رفتار سے بہہ رہی تھی۔ ایک مقام پر ٹھوکر (FALL) کی وجہ سے اس کی

رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی- جب یہ خارجی تحریک (IMPETUS) ختم ہو گیا' تو وہ پھر اپنی سابقہ رفتار سے بہنے لگ گئی- یہ کہنا کہ نہر صرف اتنے وقت تک بہتی رہی جب تک اس کی لہروں سے اس کی رفتار محسوس طور پر نظر آتی تھی- اور اس کے بعد وہ جوئے رواں کی بجائے ساکت و ساکن جوہڑ بن گئی کم سمجھی کی دلیل ہے-

چار اہم شقیں

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس میں تین چار باتیں مزید غور کے قابل ہیں-

(۱) وہ کیا چیز تھی جس سے اس خاص دور میں انسانوں کی ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس کے اعمال صالح' خدائی قوانین کے لیے اس قدر تحرک کا موجب بن گئے-

(۲) بعد میں وہ چیز باقی کیوں نہ رہی-

(۳) اگر وہ چیز باقی نہیں رہی تھی' تو بھی اس زمانے کے عام انسانی ذہن نے ان بلند حقائق کو اپنا کیوں نہ لیا- اور

(۴) اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ قوانین خداوندی' بعد میں پھر اپنی سابقہ رفتار سے چلنے لگ گئے اور اب تک چلے جا رہے ہیں یعنی یہ نہر' جوئے رواں ہے- ساکن جوہڑ نہیں جو ایک مقام پر رک کر کھڑی ہو گئی ہو اور آگے چلنے کے قابل نہ رہی ہو-

یہ سوالات ایسے ہیں جو بڑے گہرے غور و تدبر کے محتاج ہیں- اس لیے ان کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا اسے بڑی توجہ سے سمجھنے کی کوشش کرنا-

نظام تعلیم و تربیت

سب سے پہلے شق اول کو لو- یعنی اس سوال کو کہ وہ چیز تھی جس سے اس خاص دور میں انسانوں کی ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس کے اعمال صالح سے خدائی قوانین کو ایسی تقویت (Momentum) مل گئی- یہ چیز سلیم! بڑی صاف اور سیدھی تھی- قرآن کریم نے اسے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ نبی اکرمؐ کا طریق عمل یہ تھا کہ یتلوا علیھم ایاتہ- ویزکیھم- ویعلمھم الکتاب والحکمتہ..... (63/2)

اس پروگرام کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ یہ کہ آپؐ لوگوں کے سامنے قرآن پیش کرتے تھے یعنی جن لوگوں کو اس تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی تھی ان کے سامنے قرآن اور خالص قرآن پیش کیا جاتا تھا۔ اس میں انسانی خیالات' تصورات' نظریات' معتقدات کی قطعاً آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے قرآن ملتا تھا اور اسی کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ یہ دعوت علی وجہ البصیرت دی جاتی تھی۔ ادعوا الی اللہ علی بصیرتہ انا ومن اتبعنی (12/108) "میں اور میرے متبعین خدا کی طرف دعوت علی وجہ البصیرت دیتے ہیں۔" یعنی قرآن کو دلائل و براہین اور علم و بصیرت کی بناء پر پیش کیا جاتا تھا۔ اسے نہ معجزات کے زور سے منوایا تھا تھا اور نہ ہی کسی کے سر پر تلوار رکھ کر اسے مسلمان ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

جو لوگ اس طرح علی وجہ البصیرت (دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ) قرآن کی صداقت کو تسلیم کر لیتے' ان کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ نبی اکرمؐ انہیں سمجھاتے کہ خدا کے احکام و قوانین (الکتاب) کیا ہیں اور ان کی غرض و غایت (الحکمۃ) کیا۔ اسی طرح انہیں الاسلام کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں' اپنی عقل و فکر سے کام لینے اور پیش آمدہ معاملات کا حل دریافت کرنے کے طور طریقے سکھائے جاتے۔

اور اس کے ساتھ ہی صحیح آزادی کی ایسی فضا پیدا کی جاتی جس سے ان کی ذات (Personality) کی نشو و نما (تزکیہ نفس) ہوتی جاتی۔ ان کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں میں بالیدگی پیدا ہوتی۔ انہوں نے (اس سے پیشتر) انسانوں کی خودساختہ رسوم و قیود کی جن زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ رکھا تھا وہ سب ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتیں اور وہ محسوس کر لیتے کہ دنیا میں نہ کسی انسان کے محکوم ہیں نہ محتاج۔ قرآنی معاشرہ میں کوئی کسی کا محکوم و محتاج نہیں ہوتا۔ اس سے ان کی ذات کی نشو و نما ہوتی۔

یہ تھا وہ سیدھا سادہ پروگرام جس سے نبی اکرمؐ نے ایک ایسی جماعت پیدا کر دی تھی۔ جس کے اعمال صالح' قوانین خداوندی کی رفتار میں اس قدر محیرالعقول تیزی پیدا کرنے کا موجب بن گئے تھے اور اس طرح ایک ایسا معاشرہ قائم ہو گیا تھا جس میں اسلام کے درخشندہ و تابناک نتائج چند دنوں میں سامنے آ گئے تھے۔

قرن اول کے مسلمانوں میں فرق مدارج

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جتنے لوگ نبی اکرمؐ کی زندگی میں مسلمان ہو گئے تھے (اگرچہ اصطلاح میں ان سب کو صحابہ کہتے ہیں) ان سب کو تعلیم و تربیت نبویؐ استفادہ کے یکساں مواقع حاصل نہیں ہوئے تھے۔ قرآن اس حقیقت کو واضح انداز میں بیان کرتا ہے۔ مثلاً سورہ حجرات میں ان بدوی قبائل (اعراب) کا ذکر ہے جو نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ کے آخری ایام میں اسلامی مملکت کی شوکت و عظمت کو دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے قالت الاعراب امنا۔ یہ بدوی قبائل کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا۔ ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔ (49/14) "ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ تم یہ کہو کہ ہم اسلامی مملکت کے) مطیع و فرمانبردار ہو گئے ہیں۔ ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔" یہ تو بدوی قبائل کے متعلق تھا۔ خود قریش کے متعلق (جو صلح حدیبیہ یا فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو گئے تھے) فرمایا کہ لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل۔ اولئک اعظم درجتہ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا۔ وکلا وعد اللہ الحسنی۔ واللہ بما تعملون خبیر۔ (54/10) "ان سے کہو کہ تم سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے (راہ خدا میں) اپنا مال خرچ کیا اور لڑائیاں لڑیں۔ اور جنہوں نے فتح کے بعد اپنا مال خرچ کیا اور لڑائیاں لڑیں یہ دونوں (گروہ) برابر نہیں ہو سکتے۔ اول الذکر کے درجات ثانی الذکر کے مقابلہ میں بہت بلند ہیں۔ اگرچہ اسلام کی برکات و حسنات کے سلسلہ میں اللہ کے وعدے دونوں کے ساتھ ہیں۔" یہ (بلند مدارج کے حامل) وہ حضرات ہیں جنہیں قرآن نے "مومن حقا" کہہ کر پکارا ہے۔ سورہ انفال میں ہے۔ والذین امنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ۔ والذین اووا ونصروا۔ اولئک ھم المومنون حقا۔ لھم مغفرتہ ورزق کریم۔ (8/74) "اور جو لوگ ایمان لائے۔ انہوں نے ہجرت کی۔ اور اللہ کی راہ میں ہر قسم کا جہاد کیا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے (ان مہاجرین) کو پناہ دی اور دین کے استحکام میں ہر قسم کی) مدد کی۔ یہی لوگ ہیں پکے اور سچے مومن۔ ان کے لیے ہر تخریب سے حفاظت کا سامان اور باعزت رزق

ہے۔" جنہوں نے ان کے بعد ہجرت کی اور جہاد کیا۔ ان کے متعلق کہا گیا کہ فاولئک منکم (8 \ 75) "وہ بھی تم میں سے ہیں۔" یہی (اول الذکر) وہ "السابقون الاولون" جنہیں قران نے "محمد رسول اللہ والذین معہ" کہہ کر پکارا (48 \ 29) اور شجر اسلام کی آبیاری میں ان کی خدمات جلیلہ کو وجد و مسرت کے عالم میں سراہا ہے۔ (48 \ 29)۔ اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا سلیم! کہ بعد کے مسلمانوں کے ایمان و عمل کی قران نے تعریف نہیں کی۔ جنہوں نے ان "السابقون الاولون" کی حسن کارانہ انداز سے پیروی کی' ان کے متعلق بھی قرآن نے کہا ہے کہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ (9 \ 100) اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔" جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اس جماعت میں بعد میں شریک ہونے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اس انداز سے اسلام نہیں لائے تھے جس انداز سے السابقون الاولون ایمان لائے تھے نیز بعد میں آنے والوں کی تعلیم نبویؐ سے نسبتاً کم حصہ ملا تھا۔ "السابقون الاولون" برسوں کے غور و فکر کے بعد اس وقت ایمان لائے تھے جب ایمان لانے کے معنی اپنے آپ کو دنیا بھر کی مخالفت کا نشانہ بنا لینا اور ہر قسم کی مصیبتوں سے دوچار ہونا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان اسی صورت میں لایا جا سکتا تھا جب انسان انتہائی غور و فکر کے بعد صداقت کو پہچان لے۔ لیکن جب اسلامی مملکت قائم ہو گئی تھی اور مسلمانوں کو ہر طرف غلبہ حاصل ہو رہا تھا اس وقت ایمان لانا' (قرآن کے الفاظ میں) اپنے آپ کو اسلامی مملکت کے سامنے (SURRENDER) کر دینے کے مترادف تھا۔ یہ تھا ان دو گروہوں کے ایمان لانے کے محرکات کا فرق۔ اس کے ساتھ دوسرا اہم فرق یہ بھی تھا کہ بعد میں مسلمان ہونے والوں کو تعلیم و تربیت نبویؐ سے استفادہ کا بہت کم موقعہ ملا تھا۔

● ● ●

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اب اگلی شق کو سامنے لاؤ۔ یعنی اس سوال کو کہ جس پروگرام کے مطابق نبی اکرمؐ

نے اس قسم کی جماعت مومنین پیدا کر دی تھی' وہ پروگرام آگے کیوں نہ چلا؟ اس سلسلہ میں تم نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ صاحب! وہ تو رسول ؐ کی منفرد شخصیت تھی جس نے اپنی بے مثال "روحانی قوتوں" سے اس قسم کا انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ (رسول کے علاوہ) دوسرے انسانوں کے بس کی بات ہی نہ تھی اس لیے جب رسول اللہ دنیا سے تشریف لے گئے تو یہ سلسلہ منقطع ہو گیا! یہ سلیم! بہت بڑی غلط فہمی ہے جسے دل سے نکالنا نہایت ضروری ہے۔ اگر یہ خیال دل میں باقی رہے تو اس کا صرف اتنا ہی نتیجہ نہیں ہوتا کہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رسول ؐ اللہ کی وفات کے بعد یہ سلسلہ آگے نہیں چل سکتا تھا۔ اس سے یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اب اگر ہم لاکھ چاہیں تو بھی اسلام کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتے۔ اس تصور کا نتیجہ ناامیدی جاوید ہوتا ہے یعنی اپنی حالت سنوارنے اور مستقبل کو روشن کرنے کی طرف سے ابدی مایوسی۔ یہ ہم میں ہر صدی کے بعد خدا کی طرف سے "مجدد" کی آمد یا آخری زمانے میں "ظہور مہدی" کا عقیدہ آ گیا ہے یہ اسی مایوسی کا پیدا کردہ ہے (قرآن کریم میں ختم نبوت کے بعد' کسی آنے والے کا ذکر نہیں) اور یہ جو ہمارے ہاں آئے دن نبوت کے دعوے ہوتے رہتے ہیں ان کا بنیادی سبب بھی یہی غلط تصور ہے۔ (کہ اسلام کا احیاء نبی کے بغیر ہو نہیں سکتا) لہٰذا اس غلط تصور کا ذہن سے نکالنا ازبس ضروری ہے کہ اسلام نے جو کچھ کر کے دکھایا تھا وہ نبی اکرم ؐ کی مافوق الفطرت قوتوں کا نتیجہ تھا۔ آپ ؐ کے بعد نہ وہ سلسلہ باقی رہ سکتا تھا۔ نہ اب اس کا احیاء ہو سکتا ہے۔

جو کچھ رسول ؐ اللہ نے کیا تھا وہ بعد میں بھی ہو سکتا تھا

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ؐ کی زبان مبارک سے جو کہلوایا ہے کہ انا بشر مثلکم یوحی الی..... (18 \ 220) "حقیقت یہ ہے کہ تمہارے جیسا ایک انسان ہوں اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔" تو یہ اسی بنیادی غلط فہمی کے دور کرنے کے لیے ہے۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ نبی اکرم کو خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ حضور ؐ کی یہ وہ خصوصیت تھی جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصیت مافوق الفطرت تھی۔ لیکن اس کے بعد اسلام کو ایک عملی نظام کی صورت میں متشکل کرنے کے لیے آپ ؐ نے جو کچھ کیا وہ کسی مافوق الفطرت کی بنا پر نہیں کیا۔ وہ بشری

حیثیت سے کیا۔ (یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اعلان کرتا ہے کہ حضورؐ کو قرآن کے علاوہ اور کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔) نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد خدا کی طرف سے وحی دیئے جانے کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن اس وحی کو عملی نظام بنانے کے لیے آپؐ نے جو کچھ بشری حیثیت سے کیا وہ سلسلہ بدستور آگے چلا۔ خلافت (یعنی آپؐ کی جانشینی) اس حیثیت سے اور اسی مقصد کے لیے تھی۔ یہی وہ حقیقت ہے کہ جسے قرآن کریم نے یہ کہہ کر واضح کر دیا تھا کہ **وما محمد الا رسول۔ قد خلت من قبله الرسل۔ افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم.....** (3/143) محمدؐ بجزایں نیست کہ خدا کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بھی رسول ہو گذرے ہیں۔ سو اگر یہ (کل کو) مرجائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سلسلہ تو آپؐ کی ذات تک محدود تھا) اپنی پہلی روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟" اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ حضورؐ کی ذات کے ساتھ ختم ہونے والا نہیں تھا۔ اسے آگے چلنا تھا اور (نبی کے بغیر) یہ آگے چل سکتا تھا۔ آپؐ نے جو فرمایا تھا کہ **ادعوا الی اللہ علی بصیرتہ۔**" "میں تمہیں اللہ کی طرف علی وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں" تو اس کے بعد **انا ومن اتبعنی** کا اضافہ کیا تھا (108 \ 12) یعنی میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ **یامرھم بالمعروف وینھھم عن المنکر** (156 \ 7) "وہ معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔" اور یہی فریضہ آپؐ کی امت کا بھی قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ **کنتم خیر امتہ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر** (109 \ 3) تم بہترین امت ہو جسے نوع انسانیت کی بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو۔ اور منکر سے روکتے ہو۔" لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ "تلاوت آیات قرآنی۔ تعلیم کتاب و حکمت۔ اور تزکیہ قلوب و اذہان" کا جو پروگرام حضورؐ نے اختیار فرمایا تھا وہ آپؐ کی ذات تک محدود تھا۔ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ اور شجر اسلام نے جو ثمرات عہد نبویؐ میں دینے شروع کئے تھے ان کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ لیکن کچھ وقت کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کی وجوہات حسب ذیل ہیں۔

یہ سلسلہ آگے کیوں نہ چلا؟

رسول اللہ کی حیات طیبہ میں سلسلہ دعوت و تبلیغ (پہلے) مکہ اور اس کے گرد و نواح تک محدود رہا اور اس کے بعد مدنیہ اور اس کے گرد و پیش تک۔ جن حضرات کی تعلیم و تربیت اس دوران میں ہوئی' اسلام کے حقائق و تصورات ان کے قلب و دماغ میں پختگی سے مرتسم ہو گئے تھے۔ بعد میں جب پورا عرب مسلمان ہو گیا تو ان کی حالت وہی تھی جس کی طرف قرآن نے "اعراب کے مسلمان ہونے" کے ضمن میں اشارہ کیا ہے (جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں) ایک تو ان کے مسلمان ہونے کے محرکات اور تھے۔ یعنی ابتدائی حضرات (ؓ) ایک مدت تک غور و فکر کے بعد اسلام علی وجہ البصیرت قبول کرتے تھے' لیکن یہ (بعد کے مسلمان) قرآن کے الفاظ میں اسلامی مملکت کے مطیع و فرمانبردار ہو گئے تھے۔ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں داخل نہیں ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ بدقسمتی سے انہیں تعلیم و تربیت نبویؐ سے استفادہ کا موقعہ کم ملا تھا۔ ان کی تعداد زیادہ تھی اور یہ ملک کے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے تھے نیز اس کے بعد نبی اکرمؐ زیادہ عرصہ تک اس دنیا میں تشریف فرما نہ رہے حضورؐ کی وفات جلدی ہو گئی۔

فتوحات کا سلسلہ دراز

یہ حالت خود نبی اکرمؐ کی حیات مقدسہ کے آخری ایام میں تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کی حدود بہت وسیع ہو گئیں۔ (ان کے زمانہ میں مملکت اسلامی بائیس لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔) ایران کی پوری مملکت اور روما کا بیشتر حصہ پرچم اسلام کے زیر سایہ آگیا تھا۔ اگر ان علاقوں کے باشندے مملکت اسلامی سے صرف معاہدات کرتے اور اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے تو صورت حالت اور ہوئی۔ لیکن یہ سب مسلمان ہو گئے۔ اس سے نقشہ بدل گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ بالکل اسی طرح مسلمان ہوئے تھے جس طرح (قرآن میں بیان کردہ) "اعراب" مسلمان ہوئے تھے۔ (بلکہ ان کی حالت ان سے بھی گئی گذری تھی۔ وہ تو پھر بھی برسوں سے اپنے گرد و پیش صحیح مسلمانوں کو دیکھ رہے تھے اور اسلامی تصورات کا چرچا سن رہے تھے۔ ان نو مسلموں کو یہ بات بھی میسر نہیں ہوئی تھی)

ان نو مسلموں کی تعداد اس قدر کثیر رقبہ اس قدر وسیع- اور اس زمانے میں وسائل رسل و رسائل اس قدر محدود- ظاہر ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اس انداز سے ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور تھی جس انداز سے السابقون الاولون کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی- حضرت عمرؓ کو اس کا بڑا خیال تھا اور وہ اس کے متعلق بہت کچھ سوچتے تھے- یہی وہ مقامات ہیں جن کی نزاکت و اہمیت کے پیش نظر قرآن نے (سورہ النصر) میں یہ کہہ کر تاکید کی کہ اذا جاء نصر اللہ والفتح- ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا- "جب خدا کی فتح و نصرت آ جائے اور تو دیکھے کہ لوگ خدا کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں-" تو اس وقت یہ نہ سمجھ لو کہ مقصد حاصل ہو گیا- ہمارا پروگرام ختم ہو گیا- نہیں- اس وقت تو اپنے پروگرام پر شدت سے عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے- اس لیے فسبح بحمد ربک واستغفرہ- انہ کان توابا- (110/3) (اس وقت) اپنے نشو و نما دینے والے کی حمد کے پروگرام اور زیادہ سرگرمی دکھاؤ- اس سے حفاظت کا سامان طلب کرو- وہ (اپنی رحمت کے ساتھ) تمہاری طرف رجوع کرنے والا ہے- "حضرت عمرؓ کو اس قدر احساس تھا کہ (ابن حزم کی تحقیق) آپ نے قرآن کریم کا کم و بیش ایک لاکھ نسخہ مملکت کے طول و عرض میں پھیلا دیا تھا-

حضرت عمرؓ کی بے وقت شہادت

اس کے بعد ان کے سامنے تعلیم و تربیت کا مزید پروگرام بھی تھا- لیکن (امت اور ساتھ عالم انسانیت کی) انتہائی بدقسمتی کہ قبل اس کے کہ وہ اپنے پیش نظر پروگرام میں لاتے' وہ غیر متوقع طور پر (بے وقت) شہید کر دیئے گئے اور (نو مسلموں کا) یہ پورے کا پورا اپڑادہ ناپختہ رہ گیا-

ظاہر ہے کہ جب اس قدر کثیر آبادی' اس انداز سے ایک نیا دین قبول کرے تو وہ صرف "مملکت کی فرمانبرداری" کی حد تک "نیا دین" ہو سکتا ہے- ان لوگوں کے معتقدات' تصورات' نظریات سب وہی رہتے ہیں جو پہلے تھے اور جو صدیوں سے ان میں متوارث چلے آ رہے تھے- (تم نے سلیم! بابا بھیلو خان کو دیکھا تھا- اس کا خاندان دو پشتوں سے مسلمان تھا لیکن بابا کی حالت یہ تھی کہ جب چھینک آئی بے ساختہ "جے نندی" اس

کے منہ سے نکل جاتا۔ میں نے اس سے ایک دفعہ پوچھا تو کہنے لگا کہ میں جے نندی جاتی جائے گی الحمدللہ آتی آئے گی۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ پرانی "جے نندیاں" تعلیم و تربیت سے جاتی ہیں' ایسا نہ ہو تو پھر یہ اعماق قلب سے بمشکل نکلتی ہیں۔ معاشرہ کے اثر سے' ان کے لباس میں تبدیلی آجاتی ہے۔ لیکن یہ جاتی نہیں۔ اور ان کے لباس میں تبدیلی آجانا اور بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

جذبہ انتقام

یہ تو ان نو مسلم ممالک کے عوام کی حالت تھی۔ جہاں تک ان کے اوپر کے طبقے کا تعلق تھا' بات اور بھی گہری تھی۔ انہوں نے ان عربوں سے شکست کھائی تھی جنہیں وہ ابھی کل تک وحشی اور جنگلی شمار کیا کرتے تھے۔ اور شکست بھی ایسی جس سے ان کی اس قدر وسیع سلطنت اور ایسی قدیم تہذیب کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ ہونے کو تو مسلمان (یعنی اسلامی مملکت کے فرمانبردار) ہو گئے لیکن اس شکست اور محکومی کا احساس ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور اپنے حریف' عربوں کی شان و شوکت کے منظر سے ان کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ انہوں نے یہ انتقام دو طرح سے لیا۔ ایک تو بساط سیاست پر' جہاں انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے امت واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور دوسرے' مذہب کے میدان میں' وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جس چیز نے عربوں کو اس قدر قوت اور اقتدار عطا کر دیا ہے وہ اسلام کے حقائق ہیں۔ جب ہرمزان' پابجولاں' حضرت عمرؓ کے سامنے آیا اور آپ نے اس سے پوچھا اس کی کیا وجہ ہے کہ کل تک تمہاری قوت کا یہ عالم تھا کہ عرب تمہاری سرحدوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے' اور اب یہ کیفیت ہے کہ تم کسی میدان میں بھی ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے؟ تو اس نے جو کچھ جواب میں کہا' وہ سلیم! سننے کے قابل ہے۔ اس نے کہا

> کل تک طاقت کا مقابلہ طاقت سے تھا جس میں ہم بہت آگے تھے۔ خدا نہ تمہارے ساتھ تھا نہ ہمارے ساتھ۔ اب جس وقت ہم میں اور تم میں مقابلہ ہوتا ہے تو تمہارے ساتھ خدا ہوتا ہے اور ہمارے ساتھ نہیں ہوتا۔ (اسے قرآن کی اس آیت کا ترجمہ سمجھئے جس میں کہا گیا ہے کہ ذالک بان اللہ

مولی الذین امنوا- و ان الکافرین لامولی لھم- (47/11) یہ اس لیے ہے کہ اللہ مومنین کا سرپرست اور کارساز ہے اور کافروں کا کوئی سرپرست اور کارساز نہیں-)

عجمی سازش

یہ بات اس نے بڑے پتے کی کہی تھی- اہل ایران کے ارباب فکر و نظر کا طبقہ خوب سمجھتا تھا کہ یہ خدا کے ابدی قوانین ہیں جن کے اعتبار سے اس قوم میں اس قدر انقلاب واقع ہو گیا ہے- اس لیے انہوں نے اپنا بدلہ لینے کے لیے اسکیم ہی یہ سوچی کہ ان لوگوں کو قوانین خداوندی (کتاب اللہ) سے دور ہٹا دیا جائے- اس کے لیے انہوں نے کیا یہ کہ تمام غیر اسلامی معتقدات و تصورات کو اسلام کا لبادہ اوڑھا کر مسلمانوں کے معاشرے میں داخل کرتے چلے گئے اور اس طرح خدا کے ابدی قوانین کی جگہ' انسانوں کے خود ساختہ قوانین و تصورات نے لے لی- (اس وقت جو اسلام دنیا میں رائج ہے' اس کا بیشتر حصہ انہی قوانین و تصورات پر مشتمل ہے-) اس حقیقت کو مصری مورخ محمد حسین ہیکل نے اپنی مشہور کتاب ------ عمر فاروقؓ -------- میں عمدہ انداز سے بیان کیا ہے- اس نے پہلے ان خیالات کو پیش کیا ہے جو اس موضوع پر' تاریخ المورخ (History of the world Historians) میں درج ہیں- اور اس کے بعد اپنی رائے لکھی ہے- تاریخ المورخ کا بیان (ہیکل کے الفاظ میں) ہے کہ

(ایرانیوں کی) (ان نو مسلموں میں یہودی- عیسائی اور ایران کے مجوسی سب ہی شامل تھے- لیکن چونکہ ان میں ایرانیوں کی بہت زیادہ کثرت تھی اور انہی نے سب سے زیادہ اسلام کو متاثر کیا- اس لیے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا جاتا ہے- لیکن ہم "عجمی اسلام" کہتے ہیں تو اس سے مراد ہر غیر قرآنی نظریہ ہوتا ہے خواہ وہ کہیں سے آیا ہو-) مذہب کی اس تبدیلی کا اثر سیاسی پہلو پر بھی پڑا- چنانچہ جب ایرانیوں نے مدینہ اور دمشق کی حکومتوں کے خلاف بغاوت کی تو (حضرت) محمدؐ کے چچا زاد بھائی اور شرعی وارث (خلافت میں وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- (طلوع اسلام)) (حضرت) علیؓ عربی کے گرد جمع ہو گئے- جنہیں

خلافت سے دور رکھا گیا تھا۔ اور ان کے چاروں طرف جلال و تقدس کا وہ ہالہ قائم کر دیا گیا جو ان کے اسلاف اپنے قومی بادشاہوں کے گرد قائم کرتے چلے آئے تھے۔ اور پھر جس طرح ان کے بزرگ کسریٰ کو "آسیان کا بیٹا' مقدس بادشاہ کے لقب سے ملقب کرنے کے عادی تھے اور ان کی کتابوں میں "سید و مرشد" لکھا جاتا تھا' اسی طرح انہوں نے بھی اسلام کے زمانے میں (حضرت) علی ؓ کو امام کا لقب دے دیا۔ جو اپنی سادگی کے باوجود بڑے اہم معانی کا مالک ہے۔ اگر اس کے حامل میں دنیوی اقتدار اور عقلی برتری جمع ہو جائیں۔

جب (حضرت) علی ؓ وفات پا گئے تو ایرانی ان کے صاحبزادوں (حضرت) حسن اور (حضرت) حسین ؓ کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے بعد ان کی اولاد کے۔ کہا جاتا ہے کہ (حضرت) حسین ؓ نے اکاسرہ بنی ساسان کے آخری تاجدار کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ چنانچہ اس ازدواج کے بعد امامت' مقدس حق سے رشتہ بداسن ہو گئی۔ پھر کربلا کے میدان میں (حضرت) حسین ؓ کے خون نے اس وحدت کو متبرک بنا دیا جو اسلام اور قدیم ایران کے درمیان قائم ہوئی تھی۔

وہ بغاوت جس نے بنوامیہ سے حکومت چھین کر رسول اللہ ؐ کے قرابت داروں' بنو عباس' کو تخت پر بٹھا دیا' ایرانیوں ہی کی برپا کی ہوئی تھی جس کے ذریعے انہوں نے اپنے اصول امامت کی تکمیل و تصدیق کر دی' اگرچہ وہ اس گھرانے کو تاج نہ پہنچا سکے جسے تاج پہنانے کی راہ میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں تھیں۔

(ہیکل اردو ترجمہ صفحہ 20 ۔ 419)

اس اقتباس کے بعد' ہیکل لکھتا ہے۔

یہ واقعات جو تاریخ المورخ اور جن کا ذکر تمام مورخین نے کیا ہے' عہد فاروقی کے بعد پیش آئے۔ یہاں ہم نے ان کا ذکر' پڑھنے والوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرنے کے لئے کیا ہے کہ ایرانیوں کے دل شروع ہی سے عربی حکومت پر مطمئن نہیں تھے' بلکہ وہ اس سے ایام کرتے تھے۔ اول اول انہوں

نے اس کے خلاف اعلانیہ بغاوت کرنی بھی چاہی لیکن اس میں ناکامی ہوئی تو دوسرے ذرائع سے اقتدار حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگے اور عام زندگی کے تمام میدانوں میں انہیں اقتدار کا بہت بڑا حصہ بھی مل گیا۔ مسلمانوں کے ایران فتح کرنے سے ایرانی اس قدر نشتر بہ دل تھے کہ ان کے چند آدمی حضرت عمرؓ کی جان کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت جو فتح خراسان کے کچھ ہی دن بعد ہوئی' ایرانی سازش کا ہی نتیجہ تھی۔

(ایضاً صفحہ 420)

تم جانتے ہو سلیم! کہ میں نہ شیعہ ہوں نہ سنی۔ اس لئے مجھے مسلمانوں کے کسی فرقے سے مخصوص معتقدات سے کوئی تعلق نہیں ------ میں خواہ اس عقیدہ اور تصور کو غلط سمجھتا ہوں جو قرآن کے خلاف ہو------ اس لیے مسئلہ زیر نظر کو بھی میری نگاہ فرقہ وارانہ عینک سے نہیں دیکھتی۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان مفتوحہ علاقوں کے نومسلموں نے اپنے معتقدات کو اسلام کا رنگ دے کر مسلمانوں کے معاشرے میں پھیلا دیا۔ اور آہستہ آہستہ انہیں "خدا" (یعنی کتاب خدا) سے بیگانہ بنا دیا۔ جو غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کے غلبہ کا باعث تھا۔ اس طرح انہوں نے فولادی شمشیروں کا بدلہ ذہنی شمشیروں کے ذریعے لے لیا۔ ان کی ہی اس سازش کو اس (بدقسمت) واقع سے اور تقویت مل گئی کہ عباسیوں نے سلطنت ہی ایرانیون کے بل بوتے پر حاصل کی تھی۔ جس سے ان کا اقتدار معاشرے کہ ہر گوشے پر چھا گیا تھا۔ اور چونکہ یہ پڑھے لکھے لوگ تھے اس لیے ان کا وضع کردہ "جدید اسلام" کتابی شکل میں بھی عام ہو گیا۔ ہمارے ہاں جو کچھ دین کے نام سے پڑھایا جاتا ہے وہ بیشتر ان ہی کتابوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حادثے کے بعد ہماری تاریخ سیاست اور مذہب (کے دونوں میں) انہی عجمی ریشہ دوانیوں کی مقنوع داستاں ہے۔

یہ فتوحات نہ ہی ہوتیں تو ----- اچھا تھا؟

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر صحیح اسلام سے متعلق تعلیم و تربیت کا وہ سلسلہ جسے نبی

اکرمؐ نے شروع کیا اور جو خلافت کے اولین ایام تک جاری رہا' آگے چل کر رک گیا---------- اور نہ صرف یہ کہ وہ سلسلہ رک گیا بلکہ اس کی جگہ ایک نئے "اسلام" نے لے لی------- اس ضمن میں بعض لوگ کہا کرتے ہیں اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ لڑائیاں نہ لڑی جاتیں تو اسلام اس مصیبت سے بچ جاتا جو ان نو مسلموں کے ہاتھوں اس پر وارد ہوئی لیکن وہ اس رائے کے اظہار کے وقت ایک اہم حقیقت کو نظرانداز کر دیتے ہیں- یہ لڑائیاں' جوع الارض (ہوس ملک گیری) کی تسکین کے لیے نہیں لڑی گئی تھیں- میں اپنے موضوع سے دور ہٹ جاؤں گا ورنہ میں تمہیں تفصیل بتاتا کہ ان لڑائیوں کے محرکات و اسباب کیا تھے- مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ

(۱) اسلام ایک نظام زندگی ہے جو صرف ایک آزاد' اسلامی مملکت میں عملی شکل میں سامنے آ سکتا ہے- یہ تھا وہ بنیادی مقصد جس کے لیے نبی اکرمؐ نے ایک مملکت کی تشکیل کی اور اس مملکت کا تحفظ' خلافت نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا-

(۲) ایران اور روم کی مملکتیں' اس جدید اسلامی مملکت کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی تھیں- یہ مملکت ان کی نگاہوں میں خریف تازہ تھی اور وہ لوگ اس کے استحکام میں اپنے لیے سخت خطرہ محسوس کرتے تھے- ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ اس مملکت کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالیں- اگر خلافت کے اس دور میں' ان مملکتوں کے مشوم عزائم کی روک تھام نہ کی جاتی تو اسلامی مملکت کا وجود باقی نہ رہتا اس مقصد کے لیے جیوش اسلامیہ کا آگے بڑھنا ناگزیر تھا- جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے' اگر یہ ممالک صرف معاہدات کر لیتے تو بھی صورت مختلف ہوتی- لیکن وہاں کے باشندے (شباشب) مسلمان ہو گئے اور اس سے وہ خرابیاں پیدا ہو گئیں جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے- اس پر انتہائی بدقسمتی یہ کہ حضرت عمرؓ بے وقت شہید کر دیئے گئے- اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے اور ان ممالک میں اسلام مستحکم طور پر رائج ہو جاتا تو پھر اس قدر خطرات پیدا نہ ہوتے-

(۳) اس مقام پر یہ بھی اضافہ ضروری ہے کہ اسلامی مملکت میں صرف دفاعی جنگ کی شکل ہی پیدا نہیں ہوتی- [illegible] ایک ضرورت اور بھی لاحق ہو جاتی ہے- مثلاً اگر کسی

دوسری مملکت کے علاقہ میں (غیر مسلم) انسانوں پر سخت مظالم ہو رہے ہوں اور ان بے چاروں کا کوئی پریشان حال نہ ہو' تو اسلامی مملکت کے ذریعے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان مظلوموں کی مدافعت کے لیے ہر ممکن کوشش کرے۔ جس کی آخری (اور بعض حالات میں ناگزیر) صورت' جنگ ہوتی ہے۔ (یہ وہی مقصد ہے جس کے لیے اب تجویز ہو رہا ہے کہ اقوام متحدہ (U.N.O) کے پاس اپنی فوجیں ہونی چاہیں تاکہ وہ انہیں عندالضرورت ان علاقوں میں بھیج سکے جہاں قانون شکنی ہو رہی ہو اور اس کی روک تھام کی کوئی اور صورت باقی نہ رہے) یہ بھی ایک مقصد تھا جس کے لیے خلافت کو اپنی فوجیں بعض مقامات کو بھیجنی پڑیں۔

ان حالات کے پیش نظر' سلیم! تم اس متفق ہو گئے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خلاف کو یہ لڑائیاں نہیں لڑنا چاہیے تھیں وہ حقیقت سے کس قدر بے خبر ہیں۔

انسانی ذہن نے اسلامی حقائق کو اپنایا کیوں نہ؟

اب تم تیسری شق کو لو۔ یعنی اس سوال کو کہ اگر تعلیم و تربیت کا وہ سلسلہ جاری نہ بھی رہ سکا تھا' تو بھی عام ذہن انسانی نے اسلام کے ان حقائق کو جو اس طرح بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آ چکے تھے' خود بخود کیوں نہ اپنا لیا؟ اس نے خود ساختہ قوانین کو ان پر کیوں ترجیح دی؟ اس سوال کے متعلق ضمناً پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ یعنی جب ابدی حقائق اپنی عام رفتار سے چلتے ہیں تو ذہن انسانی ان سے رفتہ رفتہ مانوس ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب وہ انقلابی طور پر نمودار ہوتے ہیں تو اپنے زمانے کی سطح سے بہت اونچے ہوتے ہیں اس لیے عام انسانی ذہن ان کا خوگر نہیں ہوتا جب تک خاص تعلیم و تربیت سے اسے ان کے لئے تیار نہ کیا جائے۔ اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا کرتے ہیں کہ ہر انقلابی آواز قبل ازوقت ہوتی ہے۔ "انقلابی آواز" کے معنی ہوتے ہیں خدا کے کسی ابدی قانون کو انسانی رفتار سے سامنے لانے کی دعوت اور "قبل ازوقت" سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں وہ آواز اٹھتی ہے اس زمانے تک کا انسانی ذہن اس قانون سے مانوس نہیں ہوتا۔ اگر اس زمانے کا انسانی ذہن اس قانون سے مانوس ہو چکا ہو تو وہ آواز انقلابی نہیں ہوتی اسے اسی فضا کی پیداوار کہا جائے گا۔ یہی وجہ ہے جو کہا جاتا ہے کہ انقلابی آواز کے لئے اس کا دور سازگار نہیں ہوتا۔ "سازگار نہیں ہوتا" سے مراد یہ ہے اس دور کے انسان اس آواز کو اچھی طرح (Appreciate) نہیں کر سکتے۔ ان کی فکری سطح اتنی اونچی نہیں ہوتی کہ وہ اس غیر معمولی آواز سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکیں۔ وہ آواز ان کے لیے بڑی غیرمانوس ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ تم رسول کی دعوت کو تو چھوڑو' کہ وہ اپنے دور سے صدیوں آگے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں تو عام نابغہ (Genius) کی حالت یہ ہوتی ہے۔

زمانہ کی شکوہ سنجی!

کہ وہ اپنے زمانے کے ہاتھوں اپنی قدرشناسی کا رونا روتے مرجاتا ہے تم اپنے محبوب (شاعر) غالب کو دیکھو۔ وہ کس طرح اپنے زمانے کی پستی سطح کا شکوہ سنج ہے! کہیں وہ ان سے کہتا ہے کہ ------ مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست-------- کہیں اپنی اس دشواری

کا گلہ خواں ہے کہ------ گویم مشکل' وگرنہ گویم' مشکل------ لیکن چونکہ اپنے مقام اور اپنے دور کی سطح سے خوب واقف ہے اس لئے نہایت حتم و یقین اور خود اعتمادی سے یہ کہہ کر اپنے دور سے آگے نکل جاتا ہے کہ

قدر شعر من بہ گیتی بعد من خواہد شدن
ایں ے از قحط خریداراں کہن خواہد شدن

یہی کچھ اقبال کے ساتھ ہوا- وہ بھی اپنے آپ کو "گل نخستیں" "آدم اول" شاعر فردا "کہتا ہوا چلا گیا- اور اپنی آواز کے قبل از وقت ہونے کا اعلان ان الفاظ میں کر گیا کہ

چوں رخت خویش بربستم ازیں خاک ہماں گفتند بلاآشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

اور غالب ہی کی طرح یہ "پیش گوئی کر گیا کہ

پس ازمن شعر من خوانند' وی یا بندوی
گویند
جہانے راد گرگوں کردیک مرد خود آگا ہے

اور ایک غالب اور اقبال ہی پر کیا موقوف ہے- یہ تمہیں آج مختلف ممالک کی تاریخ میں آسمان فکر و نظر کے درخشندہ ستارے نظر آ رہے ہیں' ان سب کے ساتھ ان کے زمانے نے یہی کچھ کیا تھا- وہ اپنے زمانے میں روٹی کے ٹکڑے تک کے محتاج رہے- محتاج ہی نہیں رہے بلکہ ان کی زندگی اکثر قید و بند میں گذری اور مصائب و آلام کا شکار رہی- (وہ گمنامی کی زندگی جیئے یا بدنامی کی موت مرے- لیکن مرنے کے بعد آنے والے زمانے نے ان چیتھڑوں' گڈریوں تک کو ڈھونڈ کر نکالا جن میں انہوں نے زندگی کے دن کاٹے تھے اور انہیں اپنے عجائب گھروں کی یادگار اور پرستش گاہوں کی زینت بنایا- ان کا ایک ایک لفظ سونے کے حروف میں لکھا اور جواہرات کے ترازوؤں میں تولا گیا-

قرآنی انقلاب کی بلند سطح

ان حقائق کی روشنی میں سلیم! ذرا اس زمانے کی علمی' ذہنی' فکری' معاشی' معاشرتی' تمدنی' سیاسی اور عمرانی سطح پر غور کرو جس میں قرآن آیا- اور اس کے بعد اس انقلاب

آفریں پیغام کو دیکھو جو قرآن لایا تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ پیغام اس زمانے کی سطح سے کس قدر اونچا اور اس دور سے کتنا آگے تھا۔ ذرا سوچو سلیم! کہ جس زمانے میں دنیا کی حالت یہ تھی کہ بڑے بڑے مفکرین سے لے کر عام انسانوں تک' مندروں اور قربان گاہوں' معبدوں اور خانقاہوں کی پراسرار عجوبہ پرستیوں کے شکار اور راہبوں' پجاریوں' منتروں اور کاہنوں کے دام تزویر کے اسیر تھے اور انہیں کار دبار خداوندی کے براہ راست کار پرواز تصور کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہ آواز کہ انسان اور بندے کے درمیان کوئی تیسری طاقت حائل نہیں کس قدر زمانے کی سطح سے اونچی تھی؟

جس زمانے میں ساری دنیا کا معمول یہ تھا کہ وہ راجہ کو ایشور کا اوتار' قیصر کو خدائی اختیارات کا حامل اور شہنشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھتی اور ان کی اسی نہج پر پرستش کرتی تھی۔ اس زمانے میں یہ پکار کہ کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اور یہ کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہیں' اس دور کے کان کے لئے کس قدر ناآشنا اور اس زمانے کے قلب کے لئے کتنی نامانوس تھی۔

جس زمانے میں عزت کا معیار نسلی تفوق' شرف و مجد کا معیار خاندانی اور قبائلی نسبتیں اور قیادت و سیادت کا مدار حسب و نسب پر سمجھا اور مانا جاتا ہو اور ان امتیازات کے استحکام و بقا کے لئے ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں تباہ وبرباد کر دی جائیں اور ایسا کرنے میں ہر شخص' ہر قبیلہ' ہر ملک اور ہر قوم انتہائی فخر محسوس کرے' اس زمانے میں یہ پیغام کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے ایک جیسا ہے اور عزت و تکریم کا معیار اس کے ذاتی جوہر ہیں نہ کہ آبائی نسبتیں۔ کس قدر اجنبی اور "غیر فطری" تھا!

جس دور میں انسانوں کی تقسیم ملکوں کی چاردیواری اور قوموں کی حدبندیوں کی رو سے ہوتی تھی اور وطن اور قوم کی خاطر جان دینا زندگی کا مقدس ترین فرض سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں یہ دعوت کہ انسانوں کی تقسیم اور قوموں کی تشکیل' وطن' رنگ' نسل' زبان وغیرہ کے اشتراک سے نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی رو سے ہوتی ہے' کس قدر قابل فہم اور "ماورائے سرحد ادراک" تھی!

جس زمانے میں حالت یہ تھی کہ انسان نے' فطرت کے ہر حادثہ اور کائنات کے ہر تغیر کے لئے ایک ایک الگ "خدا" تجویز کر رکھا تھا جس کی خوشنودی اور ناراضگی ہر خوش آئند یا الم انگیز واقعہ کا موجب بنتی تھی' اس زمانے کے انسان سے یہ کہنا کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے ایک لگے بندھے قانون کے تابع ہوتا ہے- یہاں ہر معلول (EFFECT) کے لئے ایک علت (CAUSE) اور ہر سبب کے لئے ایک مسبب ہے- اور یہ سب کچھ ایک غیر متبدل قاعدے کے مطابق ہوتا ہے جس میں کبھی کسی کے لئے کوئی استثناء نہیں ہوتی' کتنا بڑا محیرالعقول تصور اور کیسا ناقابل تسلیم دعوی تھا-

جس زمانے میں انسان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے ذہن کی تراشیدہ موہوم قوتوں کے سامنے بے دست و پا سمجھ کر اپنے آپ کو قدم قدم پر مجبور و مقہور پاتا تھا' اس زمانے میں انسان سے یہ کہنا کہ ان موہوم قوتوں کا کوئی وجود نہیں اور کائنات کی تمام موجود قوتیں اس کے لئے تابع فرمان کر دی گئی ہیں تاکہ وہ ان سے اپنا کام لے- یہ ایک ایسی آواز تھی جس پر کوئی کان دھرنے کے لئے تیار نہیں تھا-

جس زمانے میں انسان کی علمی سطح کا یہ عالم تھا کہ گاؤں میں جو شخص دس سے اوپر گنتی جانتا تھا اسے مافوق البشر تصور کیا جاتا' اس زمانے میں اور تو اور خود پیغمبر کے متعلق یہ اعلان کہ وہ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے' انسان کے ذہن میں سمانے والی بات ہی نہیں ہو سکتی تھی-

جس زمانے میں یہ ایک مسلمہ تھا کہ مقدس بزرگ وہ ہے جس سے کوئی نہ کوئی شعبدہ سرزد ہو' اس زمانے میں یہ کہنا کہ ہم نے پیغمبر تک کو بھی کوئی حسی معجزہ نہیں دیا اور کسی دعوی کے جھوٹے اور سچے ہونے کا معیار یہ ہے کہ علم و بصیرت اس کے متعلق کیا کہتے ہیں اور اس کے ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے' ایک ایسی بات تھی جسے "عقل" تسلیم ہی نہیں کر سکتی تھی! پیغمبر اور معجزہ ہی کوئی نہیں! مذہب کی باتیں اور ان کا مدار عقل و بصیرت پر!! شریعت کی رسومات اور ان کی پرکھ' نتائج کی رو سے!!! اسے اگر وہ بوالعجبی قرار نہ دیتے تو اور کیا کہتے؟

جس زمانے میں مزدور (LABOURER) تو ایک طرف' غلام (SLAVE) تک کو

فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہو' اس زمانے میں یہ آواز اٹھانا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کا مالک بھی بیٹھے۔ "پاگل پن" کی بات نہیں تو اور کیا قرار پاتی؟

اور جس زمانے میں قارون کی سی دولت کو خدا کا فضل قرار دیا جاتا ہو۔ زمینداری اور جاگیرداری کو فطرت کا عطیہ ٹھہرایا جاتا ہو اور ذاتی املاک و مقبوضات پر کسی قسم کی حد بندی خلاف قانون و شریعت قرار پاتی ہو' اس زمانے میں یہ نعرہ بلند کرنا کہ دولت جمع کرنا بدترین جرم ہے۔ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ رزق کے دروازے تمام نوع انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہیں ہر فرد کی ضروریات زندگی بہم پہنچانا اور اس کے مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما' معاشرہ کا بنیادی فریضہ ہے۔ کس قدر تحیر انگیز آواز ہو گی۔

حیرت انگیز انقلاب

ذرا غور کرو سلیم! کہ چھٹی صدی عیسوی میں اس قسم کے تصورات اور اس انداز کے نظریات زندگی اس وقت کے ذہن انسانی کے لئے کس قدر نامانوس تھے۔ یہ وہ انقلاب آفریں تصورات تھے جنہیں اپنانے کے لے زمانہ ابھی تیار ہی نہیں تھا۔ دنیا ان سے ابھی بہت پیچھے تھی۔ وہ تو خیر پھر بھی چھٹی صدی عیسوی تھی جسے ازمنہ مظلمہ (DARK AGES) کہتے ہیں۔ قرآن کے انقلابی تصورات کا تو یہ عالم ہے کہ خود ہمارا زمانہ یہ بیسویں صدی جسے تہذیب و تمدن اور علم و عقل کا بلند ترین مظہر سمجھا جاتا ہے' یہ بھی اس کے کئی ایک تصورات سے ہنوز بہت پیچھے ہے۔ ان تصورات کی سطح اتنی بلند ہے کہ ابھی زمانہ کو نامعلوم ان تک پہنچنے کے لئے کتنی منزلیں اور طے کرنی پڑیں۔ ان حالات میں تعجب انگیز بات یہ نہیں کہ قرآن کا پیش کردہ نظام (تمہارے خیال کے مطابق) زیادہ عرصہ تک چلا کیوں نہیں۔ تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ اس زمانے میں اتنے لوگ کس طرح پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنے زمانے کی سطح سے اتنے بلند اور نامانوس تصورات کو اپنایا اور انہیں عملاً" متشکل کر دیا۔ سلیم! جب میں اس مسئلہ کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہوں تو اس ذات اقدس و اعظم" کی تحیر انگیز تعلیم و تربیت کے حسن تصور سے میری روح وجد میں آجاتی ہے جس

نے اس دور میں ایسے افراد تیار کر لئے جنہوں نے اس قسم کے نظام کو اپنا کر دکھایا- میرے نزدیک حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ جن حالات میں دنیا کا ہر نابغہ (GENIUS) اپنے زمانہ کی قدرشناسی کا رونا رو کر اور اپنے آپ کو "آنے والے زمانے کا انسان" کہہ کر چلا جائے حضورؐ ان حالات میں کہیں کہ خیر القرون قرنی- سب سے بہتر میرا زمانہ ہے- جس میں اس قسم کا انقلاب آفریں نظام' جو زمانہ کی سطح سے منزلوں اونچا ہے' اس حسن و خوبی سے متشکل ہو کر سامنے آگیا ہے- اگر تم سلیم! اس نقطہ نگاہ سے بھی دیکھو تو حضور نبی اکرمؐ تمام دنیا کے انقلابی قائدین میں سب سے آگے اور سب سے اونچے نظر آئیں گے- ذرا سوچو! کہ ان تصورات کو جن تک زمانہ تیرہ سو سال میں بھی کماحقہ نہیں پہنچ سکا نہ صرف اپنے رفقائے کار کے ذہن نشین کرانا بلکہ انہیں ان کے ہاتھوں سے عملاً" متشکل کرا دینا' اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ کتاب و حکمت کی ایسی حقیقت کشا اور محیرالعقول تعلیم اور انسانی صلاحیتوں کا اس قدر ناقابل تصور تزکیہ (نشو و نما) اسی قسم کے معلم و مربی کے ہاتھوں عمل میں آ سکتا تھا- حضورؐ کا وہ عدیم النظیر کارنامہ جس پر خدا اور کائنات کی تمام تعمیری قوتیں غلغلہ ہائے تبریک و تحسین بلند کرتی تھیں-

محیرالعقول معاشرہ

ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی- (33/56) اور حضورؐ کے ساتھ اس جماعت مومنین کے لئے بھی جو ساری دنیا سے الگ ہٹ کر اور اپنے زمانے کی سطح سے منزلوں بلند ہو کر اس قسم کے ناممکن المتصور نظام کو عملاً" متشکل کر رہے تھے- ھو الذی یصلی علیکم وملائکتہ- 47 \ 33) سوچو سلیم! اس زمانے میں (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) قریش کے مرکز مکہ کے اندر اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار اور عجم (فارس) کا "عامی (سلمانؓ) روم کا ایک مزدور' (صہیب رضی اللہ عنہ) اور حبش کا ایک غلام (بلالؓ) نہ صرف ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے تھے بلکہ باہمی رشتے ناطے بھی کرتے تھے' کس قدر محیرالعقول تھا- پھر اس معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا کر دینا کہ اور تو اور خود رسولؐ اللہ جب کسی غلام اور لونڈی سے بھی کوئی بات کہتے تو وہ بغیر کسی جھجک کے پوچھ لیتے کہ حضورؐ آپ ایسا وحی کی رو سے فرماتے

ہیں یا یہ آپ کا ذاتی مشورہ ہے۔ اور جب آپ فرماتے کہ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے تو وہ نہایت آزادی سے کہہ دیتے کہ معاف فرمایئے! اس باب میں میرا فیصلہ کچھ اور ہے اور اس لئے میں اس مشورہ کو نہیں مان سکتا۔ کتنا بڑا تھا یہ انقلاب جو ذہنیتوں میں پیدا کر دیا گیا تھا۔ اور مملکت میں ایسا نقشہ پیدا کر دینا کہ اگر کسی دوسرے کی رائے زیادہ بہتر ہے تو امیر مملکت (نبی اکرمؐ) اسے خود اپنی رائے پر ترجیح دیتے اور بڑے سے بڑے اہم معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرتے کتنی بڑی تبدیلی کا آئینہ دار تھا۔ اس سے بھی آگے بڑھو تو رسول اللہؐ کی وفات پر حضرت صدیق اکبرؓ کا پورے مجمع سے یہ کہنا کہ جو شخص محمدؐ خدا کے ایک رسول تھے۔ وہ اپنا وقت پورا کر کے دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ اس سے اس نظام پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ جسے حضورؐ نے قائم کیا تھا۔ سوچو سلیم! کہ یہ آواز اس زمانے میں کتنی قبل از وقت تھی۔ پھر حضورؐ کی وفات پر لوگوں کا جمع ہو کر اپنے میں سے ایک امیر چن لینا اور بلالحاظ لینا اور بلالحاظ قرابت و وراثت سب کا اسے امیر تسلیم کرنا اور اس دور کے ذہن انسانی کے لئے کس قدر نامانوس واقعہ تھا! اور خود رسولؐ اللہ کا یہ اعلان کہ میرے گھر میں ایک پیسہ بھی جمع نہیں۔ اور جو اشیائے مستعملہ میں چھوڑ رہا ہوں' اس کا کوئی وارث نہیں۔ وہ تمام امت کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ اس زمانے کے لئے کس قدر تحیر انگیز تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بہ حیثیت امیرالمومنین' صرف اتنا کفاف (روزینہ) لینا جتنی ایک مزدور کی اجرت ہوتی ہے' اور اپنی وفات کے وقت اس رقم کو بھی بیت المال میں یہ کہہ کر واپس داخل کر دینا کہ معلوم نہیں میں اس رقم کے برابر کام بھی کر سکا ہوں یا نہیں' اس زمانہ کی سطح سے کس قدر اونچا فیصلہ تھا؟ حضرت عمرؓ کا اپنی بیوی سے یہ کہنا کہ قیصر کی بیوی نے (تمہارے عطر کے تحفہ کے بدلے میں) جو جواہرات بھیجے ہیں وہ بہ حیثیت امیرالمومنین کی بیوی کے بھیجے ہیں نہ کہ تمہاری ذاتی حیثیت سے اس لئے انہیں بیت المال میں داخل کرنا چاہیے اس زمانے کی فضا میں کس قدر تعجب انگیز سی بات تھی اور ان کا یہ فیصلہ کہ مفتوح زمینیں' سپاہیوں میں تقسیم نہیں ہونی چاہیں بلکہ ملت کی مشترکہ تحویل میں رہنی چاہیں' تاکہ اس سے موجودہ اور آنے والی نسلیں یکساں طور پر فائدہ اٹھائیں اس دور کے لوگوں کے لئے کس قدر حیرت افروز تھا! پھر وادی شام کی اس

بڑھیا کا یہ کہنا کہ اگر خلیفہ المسلمین' امت کے تمام افراد کے حالات سے باخبر رہنے اور ان کی ضرورت کو ازخود پورا کرنے کا انتظام نہیں کر سکتا تو اسے خلافت کو چھوڑ کر الگ ہو جانا چاہیے کیونکہ وہ اس کا اہل نہیں' اس زمانے کے لئے کس قدر ناقابل تصور تھا۔ اور حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ میں گیہوں کی روٹی اس وقت کھاؤں گا جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی میسر آ رہی ہے ورنہ میں جو کی روٹی ہی کھاؤں گا اس زمانے کے آسمان کی آنکھ کے لئے کیسا تحیر انگیز تھا؟ سوچو سلیم! کہ اس زمانے میں اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں اس قسم کے فیصلہ بہ تکلف نہ کئے جائیں بلکہ زندگی کا عام معمول بن کر ازخود سامنے آتے جائیں' کس قدر قبل از وقت تھا؟ (جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' ذہن انسانی تو تیرہ صدیاں آگے بڑھنے پر بھی اس سطح تک نہیں پہنچا کہ وہ ان تصورات کو اپنا کر زندگی کا معمول بنا لے۔ لہٰذا اس زمانے میں اس قسم کا نقشہ پیدا کر دینا کتنی بڑی کامیابی تھی۔

ذہن انسانی کو بلند کیا جا سکتا ہے

اس مقام پر اس غلط فہمی کو رفع کر لینا بھی ضروری ہے کہ میں نے کہا کہ انقلابی دعوت اس زمانے کے عام ذہن انسانی سے بہت اونچی سطح پر ہوتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دور کا انسانی ذہن اس دعوت کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ وہ دعوت سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن (جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں) اس کے لئے خاص جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے' اور انسانی ذہن بڑا سہل انگار واقع ہوا ہے۔ یہ محنت اور کاوش سے جی چراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقلید کی روش (جس میں انسان کو کچھ سوچنا ہی نہیں پڑتا' بلکہ اس میں سوچنا حرام سمجھا جاتا ہے) بڑی آسانی سے خودبخود آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ محنت اور کاوش سے ہر دور کے انسانی ذہن کی سطح بلند ہو سکتی ہے۔ اسلام کے قرن اول کی تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔

ہنگامی انقلاب سے فائدہ کیا؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے سلیم! کہ اس قسم کے ہنگامی انقلابات سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟ اگر خاص جدوجہد اور کد و کاوش سے کچھ وقت کے لئے ابدی قوانین کی رفتار تیز کر

کے ان کے نتائج غیر معمولی طور پر نمودار کر لئے جائیں اور اس کے بعد' انسانی ذہن اور اس کا معاشرہ پھر اسی سطح پر چلا جائے تو عالم انسانیت کو اس سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ متعین شکل میں اس سوال کا مطلب یہ ہو گا کہ قرن اول کے اسلام نے دنیائے انسانیت کو کیا دیا؟

اسلام نے دنیا کو کیا دیا؟

اس نے دنیائے انسانیت کو بہت کچھ دیا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ خدا کے ابدی قوانین و حقائق ایک مدون کتابی شکل (قرآن) میں دنیا کے سامنے آ گئے کہ جس کا جی چاہے انہیں عملی پیکر میں لا کر ان کے خوشگوار نتائج حاصل کرے۔

دوسرے یہ کہ دنیا کو معلوم ہو گیا کہ یہ قوانین ایسے ہیں جن پر عمل کیا جا سکتا ہے یعنی یہ محض "شاعر کا خواب" (Utopia) نہیں ایک ممکن العمل (Practiceable) ضابطہ حیات ہے جس پر تاریخ کے ایک دور میں عمل کیا گیا تھا۔ اور اس کے نتائج سامنے آ گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے انقلابی دور' زمانے کی امامت کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے' عقل کا طریق کار تجرباتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے۔ اس پر عمل کرتی ہے۔ صدیوں کے تجربہ کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا اس لئے تجربہ ناکام رہا۔ اس کے بعد عقل کسی دوسرے نظریہ پر تجربہ شروع کر دیتی ہے۔ لیکن اگر کسی انقلابی دور کے نتائج اس کے سامنے ہوں تو اسے اپنے تجربہ کے متعلق صحیح نتیجہ تک پہنچ جانے کے لئے زیادہ وقت درکار نہیں ہوتا۔ تم سلیم زمانہ قبل از اسلام کی انسانی تاریخ اور زمانہ بعد از اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالو اور پھر دیکھو کہ دنیا نے جس تیزی سے زمانہ بعد از اسلام میں ترقی کی ہے' اس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اور یہ بھی اس صورت میں ہوا ہے کہ جب کہ اسلام کے قرن اول کی صحیح اور خالص تاریخ دنیا کے سامنے نہیں۔ اگر اس دور کی غیر مخلوط تاریخ دنیا کے سامنے ہوتی تو تم دیکھتے کہ آج دنیا کا نقشہ کیا ہوتا؟ یوں سمجھو کہ اس قسم کا انقلابی دور' زمانے کی گاڑی کو ایسا دھکا (Push) دے دیتا ہے جس سے اس کی رفتار میں خاصی تیزی آ جاتی ہے اور کتنا ہی فاصلہ وہ محض اپنے زور دروں (Momentum) سے طے کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ اسی زور دروں کا اثر تھا کہ اگرچہ صحیح

اسلامی معاشرہ کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا' لیکن مسلمان (اس کے بعد بھی) صدیوں تک دنیائے علم و فن میں اقوام عالم کی امامت کرتے رہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف مغرب کے بڑے بڑے مفکرین اور مورخین تک نے کیا ہے۔

یورپ کو مہذب اسلام نے بنایا

مثلاً برفا (Briffault) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب The Making of Humanity میں ایک خاص باب اس موضوع کے لئے وقف کیا ہے اور اس کا نام ہی اس نے "دارالحکومت رکھا ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے کہ

> یورپ کو حیات تو پندرھویں صدی میں نہیں ملی۔ یہ اسے عرب اور اندلسی مسلمانوں کے کلچر کے اثرات سے ملی۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ ہسپانیہ تھا۔ جب یورپ آہستہ آہستہ وحشت اور بربریت کے انتہائی پست نقطہ تک پہنچ چکا تھا تو اس وقت بغداد' قاہرہ' قرطبہ' ٹالیدو' نئی تہذیب اور تازہ افکار کے مراکز بن رہے تھے۔ یہی وہ مراکز تھے جن سے دنیا کو وہ نئی زندگی عطا ہوئی۔ جس نے ارتقائے انسانیت کی ایک جدید منزل بننا تھا۔ جب مسلمانوں کی نئی ثقافت محسوس شکل میں سامنے آئی تو دنیا میں حیات تازہ کی نمود شروع ہوئی..... اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کو کبھی تہذیب کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ (ص 90 - 189)

یہ ہے جو کچھ دنیا کو اسلام کے انقلابی دور کے دھکے سے ملا۔

اس کا ثبوت کہ اسلام آگے چل رہا ہے

اب چوتھی شق کو سامنے لاؤ۔ یعنی یہ سوال کہ کیا ثبوت ہے کہ اسلام کے ابدی حقائق اپنی معمولی رفتار سے آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ کسی جگہ رک کر کھڑے نہیں ہو گئے۔ اس کے لئے سلیم! پہلے اس زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو گا۔ جب قرآن نازل ہوا۔ اور اس کے بعد اس تیرہ سو سالہ انسانی تاریخ کا مطالعہ۔ اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس تیرہ سو سال میں انسان مختلف تجارب کے بعد ان تصورات کو اختیار کرتا چلا آ رہا ہے جو قرآن نے دیئے تھے' یا ان تصورات کی طرف جا رہا ہے جو قرآن سے پہلے دنیا میں عام

طور پر پھیلے ہوئے تھے۔

دنیا کے فیصلے

جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں' انسانی ذہن کا اس وقت فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت عین "فطرت انسانی" کے مطابق نظام جہاں بانی ہے۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور یہ تصور دیا کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہیں۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اس وقت ذہن کے لئے یہ تصور نامانوس تھا تم بتاؤ کہ اس کے بعد اس تیرہ سو سال' ذہن انسانی کا رخ ملوکیت کی سمت رہا ہے یا وہ آہستہ آہستہ "اسلام قبول کرتا" چلا گیا ہے اور قبول کرتا چلا جا رہا ہے؟

انسانی ذہن کا اس وقت فیصلہ یہ تھا کہ غلاموں کا وجود معاشرہ کا جز و لاینفک ہے اور فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ ہے اس لئے اس نظام کو کبھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ قرآن نے یہ انقلابی تصور دیا کہ تمام افراد انسانیہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس لئے کسی فرد کا دوسرے فرد کو غلام بنا لینا یکسر خلاف انسانیت ہے۔ اس وقت کے ذہن انسانی کی عام سطح نے اس تصور کو ناقابل قبول سمجھا۔ لیکن بتاؤ کہ اس کے بعد زمانے نے اس تصور کو قابل قبول سمجھا یا اپنے قدیمی تصور کو؟

ذہن انسانی کا اس وقت کا فیصلہ تھا کہ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر' ایک قوم کو دوسری قوم پر یعنی ایک نسل کو دوسری نسل پر فوقیت حاصل ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ محض توہم پرستی ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہر ذاتی سے ہے نہ کہ انتسابات نسبی سے۔ اس زمانہ نے اس تصور کو اپنے لئے ناآشنا پایا۔ لیکن تم غور کرو کہ اس زمانے کے بعد زمانہ نے اپنے لئے کیا فیصلہ کیا؟ کیا وہی نہیں جسے قرآن نے پیش کیا تھا؟

اس زمانے میں ذہن انسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ قومیں شخصیتوں کے سہارے آگے بڑھتی ہیں اس لئے ہیرو ورشپ (مشاہیر پرستی) عین تقاضائے فطرت ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ تصور ذہن انسانی کے عہد طفولیت کی یادگار ہے۔ اب قومیں آئیڈیالوجی کی بنیاد پر مرتب ہوں گی اور اپنے نظام کی خوبیوں کے سہارے آگے بڑھیں گی۔ اس زمانے نے اس تصور کو اپنے لئے ناآشنا پایا اس لئے رد کر دیا لیکن تم بتاؤ کہ آج تمہارے زمانہ کا رخ کیا اس رد

کروہ تصور کو گلے لگانے کی طرف نہیں ہے؟

اس زمانے میں جاگیرداری' زمینداری' سرمایہ پرستی کا نظام عین مطابق فطرت سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ انقلاب انگیز تصور پیش کیا کہ ہر فرد انسانی کا فریضہ تمام نوع انسانی کی نشو و نما ہے۔ اس لئے وسائل و ذرائع پیداوار کسی انسان کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتے۔ زمین پر سانپ کی طرح بیٹھ جانا اور چاندی اور سونے کے ٹکڑوں کو جمع کرتے چلے جانا انسانیت کی عدالت میں بدترین جرم ہے جس کی سزا تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اس زمانے نے اس تصور کو ٹھکرا دیا لیکن ذرا غور کرو سلیم! کیا زمانہ اسی ٹھکرائے ہوئے تصور کو اپنانے کے لئے مضطرب و بے چین نہیں ہے؟

اس زمانے میں مختلف خاندانوں' قبیلوں' قوموں کا تصور تھا لیکن عالمگیر انسانیت کا تصور کسی کے سامنے نہیں تھا۔ قرآن نے آ کر کہا کہ تمام نوع انسانی ایک عالمگیر برادری ہے اس کی عملی تشکیل اس طرح ہو سکتی ہے کہ تمام دنیا کا نظام حکومت ایک ہو۔ یہ بات اس زمانے کے عام ذہن میں نہ آئی۔ لیکن ذرا غور کرو سلیم! کہ اس کے بعد دنیا کا رخ عالمگیر انسانیت کی منزل کی طرف ہے یا انسانوں کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹنے کی طرف؟ آج دنیا نیشنلزم کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہے اس کی تفصیل معلوم کرنی چاہو تو (میری کتاب) ''انسان نے کیا سوچا؟'' میں سیاسیات سے متعلق باب پڑھو' حقیقت ابھر کر سامنے آ جائے گی۔ نیشنلزم کے بعد مغربی مفکرین نے انٹرنیشنلزم (بین الاقوامیت) کی طرف رخ کیا۔ لیکن چند ہی قدم چلنے کے بعد انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہ راستہ بھی انہیں انسانیت کی صحیح منزل کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ چنانچہ اب وہ اسے چھوڑ کر عالمگیر انسانیت (Universalism) اور تمام دنیا میں واحد حکومت (One World Government) کے تصورات کی طرف آ رہے ہیں۔ لیکن اس کے لئے انہیں کوئی بنیاد نہیں ملتی جس پر اس کی عمارت استوار کریں (یہ بنیاد قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی)

میں نے چند باتیں سلیم! محض بطور مثال لکھ دی ہیں ورنہ زندگی کا کون سا شعبہ ہے جس میں انسان اپنے ناکام تجارب کے بعد اس راستہ پر چل نہیں پڑا یا اس راستے کی

تلاش میں نہیں' جسے قرآن نے کاروان انسانیت کو منزل مقصود کی طرف لے جانے والا راستہ بتایا ہے۔ زمانہ قرآن کے انقلاب آفریں حقائق میں سے بعض کو اپنا چکا ہے' بعض کو اپنانے کے لئے مضطرب و بے قرار ہے۔ اور جو حقائق باقی ہیں وہ اس زمانے کی سطح سے بھی اونچے ہیں یہ اس لئے کہ قرآن تمام نوع انسان کے لئے آخری اور مکمل راہنمائی ہے' لہٰذا اس کے حقائق زمانے کی لہروں کے ساتھ ساتھ کھلتے جائیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ **سنریھم ایاتنا فی الافاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق**۔ (41/53) "ہم نوع انسان کو اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ بات ابھر کر سامنے آ جائے کہ قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔" زمانہ انفس و آفاق کی ان نشانیوں کو دیکھ کر قرآن کے ابدی حقائق کو اپنائے اور اس طرح رفتہ رفتہ مسلمان ہوتے چلا جا رہا ہے۔

● ● ●

جو کچھ شروع میں کہا گیا ہے اسے مختصر الفاظ میں پھر سن لو

نگہ بازگشت

(1) اسلام مجموعہ ہے ان ابدی حقائق' غیر متبدل قوانین اور مستقل اقدار کا جنہیں نوع انسان کی راہنمائی کے لئے بذریعہ وحی عطا کیا ہے اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔

(2) اسلام اپنی آفاقی رفتار سے (جو ہمارے حساب و شمار کے مطابق بہت سست ہوتی ہے) چلا آ رہا تھا اور اس طرح ارتقائی طریق سے (By Evolution) اپنے حقائق کو آہستہ آہستہ انسانی معاشرہ کا جزو بنا رہا تھا کہ نبی اکرمؐ کا ظہور ہوا۔

(3) نبی اکرمؐ نے برسوں کی سعی پیہم سے' ایک جماعت تیار کی جس کے عملی پروگرام سے اسلام کے حقائق کی آفاقی رفتار میں بڑی تیزی آ گئی اور ان کے نتائج' انسانی حساب و شمار کے مطابق' محسوس شکل میں سامنے آ گئے یہ ہے وہ دور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک کامیاب تجربہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا۔

(4) کچھ عرصہ کے بعد وہ طریق کار (یعنی دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرت اور تعلیم

کتاب و حکمت) جسے نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا باقی نہ رہا۔ اس طرح وہ خارجی قوت جس نے اسلام کے ابدی قوانین کی رفتار میں اس قدر محیرالعقول تیزی پیدا کر دی تھی ختم ہو گئی اور اسلام پھر اپنی سابقہ آفاقی (ست) رفتار سے آگے چلنے لگ گیا۔ اس سے سطح بین لوگ اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اسلام تھوڑی دور چل کر ناکام رہ گیا۔

اسلام اور مسلمان قوم کا فرق

ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم اسلام اور مسلمان قوم کو ایک ہی تصور کر لیتے ہیں اور مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اسلام دنیا میں ناکام رہا ہے۔ وہ چند قدم چل کر رک گیا اور زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکا اگر ہم اسلام اور مسلمان قوم کے فرق کو سمجھ لیں تو پھر اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ اسلام کے حقائق کی نمود تخلیق کائنات کے ساتھ ہی ہو گئی تھی اور انہوں نے رفتہ رفتہ آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا راستے میں مختلف زمانوں میں مختلف اقوام نے انہیں اپنایا تو انہیں سرفرازیاں اور خوشگواریاں نصیب ہو گئیں۔ جب انہوں نے ان حقائق کا ساتھ چھوڑ دیا تو (باقی اقوام کی طرح) مصیبتوں کا شکار ہو گئیں۔ آج سے قریب چودہ سو سال پہلے سرزمین عرب کی ایک قوم نے ان حقائق کو اپنایا تو اسے محیرالعقول ترقی نصیب ہوئی کچھ عرصہ کے بعد اس نے اسے چھوڑ دیا تو اس پر زوال آگیا۔ لیکن اسلام بدستور آگے چلتا رہا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اسلام کس طرح خراماں خراماں آگے بڑھتا اور زمانہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ ہمیں مسلمانوں کی تاریخ نہیں بلکہ نوع انسان کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ ہر وہ نظام جسے ذہن انسانی نے وضع کیا چند دنوں تک زندہ رہ کر ناکام ثابت ہو گیا۔ اور آگے صرف اسلام بڑھا۔

اسلام کی تاریخ کے شواہد

جب فرانس کے گلی کوچوں میں ملوکیت کو مٹا کر جمہوری نظام کی طرح ڈالنے کے لئے انقلاب برپا کیا گیا ہے تو وہ بھی اسلام کی تاریخ کی ایک کڑی تھی اور جب امریکہ میں غلامی کے انسداد کے لئے لڑائیاں لڑی گئیں تو وہ بھی اسلام ہی کی زریں داستان کا ایک باب تھا۔ جب ہندوستان میں اچھوتوں کو "ہری جن" (روح خداوندی کے حامل) قرار دیئے جانے کی

تحریک اٹھی تو وہ بھی اسلام ہی کی ایک ابدی حقیقت کی نمود تھی' اور اب جو امریکہ میں سیاہ اور سفید فام افراد میں تمیز رنگ و نسل مٹانے کی جدوجہد ہو رہی ہے تو یہ بھی اسلام ہی کی طرف ایک قدم اٹھ رہا ہے۔ جب اقوام عالم نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ مختلف قوموں کے تنازعات کا فیصلہ باہمی مشاورت سے کیا جائے تو وہ بھی اسلام کی پیش کردہ تجویز پر عمل درآمد کی صورت تھی اور اب جو ذہن انسانی میں یہ خیال انگڑائیاں لے رہا ہے کہ دنیا سے اسلحہ کا وجود ختم کر دیا جائے تو یہ بھی اسلام ہی کے پروگرام کی ایک کڑی ہے (جس نے چودہ سو سال پیشتر کہا تھا کہ جنگ کی اس وقت تک ضرورت ہے جب تک جنگ خود اپنے ہتھیار نہ رکھ دے) غرضیکہ اس ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں جہاں جہاں انسانوں کے خودساختہ نظام ہائے حیات ناکام ثابت ہوئے ہیں وہ اسلام کے ابدی قوانین کی صداقت کا ثبوت تھا۔ تم اگر اس نگاہ سے دیکھو سلیم! تو یہ حقیقت واضح طور پر تمہارے سامنے آجائے گی کہ دنیا کی تاریخ اور انسان کی تلاش پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

ہر کجا بینی جہان رنگ و بو زانکہ خاکش بروید آرزو
یاز نور مصطفےٰ اور ابہا ست یا ہنوز اندر تلاش مصطفےٰ است

اسلام ہی آگے بڑھ رہا ہے

تاریخ انسانیت کا اس انداز سے مطالعہ کرنے سے تم علی وجہ البصیرت دیکھ لوگے کہ (نہ صرف یہ کہ) اسلام کسی مقام پر رک نہیں گیا۔ بلکہ یہ بھی کہ اسلام کے سوا کوئی نظام زندگی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی مقام پر جا کر ناکام نہ ثابت ہو گیا ہو اور اس جگہ اسلام کے اصول نے نہ لے لی ہو۔ قرآن نے جب اسلام کے متعلق کہا تھا کہ **لیظہرہ علی الدین کلہ**۔ (48/28) ----- کہ یہ نظام خداوندی' تمام انسانی نظام ہائے زندگی پر غالب آئے گا------ تو یہ ایک حقیقت کا بیان تھا۔ قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ انسان کا مستقبل روشن ہے۔ جب (تخلیق آدم کے سلسلہ میں) ملائکہ نے خدا سے کہا کہ **اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء**۔ (2/30) --------- کہ یہ دنیا میں فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں کرے گا------ تو اس کے جواب میں خدا نے کہا کہ **انی اعلم ما لا تعلمون**۔ (2/31) -------- میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے-------- اس کے معنی یہ

ہیں کہ انسان کی آخری منزل جس میں یہ صحیح مقام آدمیت پر پہنچے گا وہ ہو گی جس میں فساد انگیزیوں اور خون ریزیوں کا خاتمہ ہو جائے اور **لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔** (2/38) کا دور دورہ ہو گا۔ انسان کو اس منزل کی طرف اسلام لئے جا رہا ہے اور یہ اسے وہاں تک پہنچا کر رہے گا۔ اس لئے کہ یہ خدائے "رب العالمین" کا تجویز کردہ نظام ہے اور رب کہتے ہی اسے ہیں جو کسی شے کو اس کے نقطہ آغاز سے بتدریج نقطہ تکمیل تک پہنچا دے۔ اگر خدا کا تجویز کردہ نظام آخری منزل تک نہ پہنچے راستے ہی میں رک جائے تو وہ خدا رب العالمین نہیں ہو سکتا۔ دنیا اس پروگرام کے مختلف اجزاء کو ایک ایک کر کے اپنا رہی ہے۔ لیکن الگ الگ اجزاء سے قرآنی نظام کے نتائج کلی مرتب نہیں ہو سکتے۔ نظام ایک غیر منقسم وحدت ہوتا ہے جو اسی صورت میں اپنے نتائج مرتب کرتا ہے جب اسے بالکلیہ (AS A WHOLE) اختیار کیا جائے۔ (جس طرح دوائی کا نسخہ اسی صورت میں اپنے صحیح نتائج پیدا کر سکتا ہے جب اس کے تمام اجزاء صحیح اوازان کے ساتھ جمع کر کے دوائی بنائی جائے) جو قوم اس نظام کو بالکلیہ اختیار کر لے اسے جماعت مومنین کہا جاتا ہے اور یہی **لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون** کی مصداق قرار پا سکتی ہے۔ انسان نے آخر الامر اس مقام تک پہنچنا ہے خواہ یہ تجرباتی طریق سے پہنچے یا ایمان کی رو سے۔ ایمان کی رو سے یہ صدیوں کی مسافت لمحوں میں طے کرے گا اور تمام نقصانات سے بچ جائے گا جو تجرباتی طریق کا لازمی نتیجہ ہیں۔

اس مقام پر یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ یہ کیا وجہ ہے کہ دنیا کی باقی قومیں اس قدر آگے بڑھ رہی ہیں اور مسلمان ان سب سے پیچھے ہیں۔ اس کی تفصیلی وجوہات تو تمہیں میری کتاب "اسباب زوال امت" میں ملیں گی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ دنیا کی دیگر اقوام "انفس و آفاق کی نشانیاں" پر غور و فکر کے بعد قرآنی حقائق کو اپنائے جا رہی ہیں اور مسلمان اس عجمی اسلام کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جس کی رو سے سوچنا اور سمجھنا حرام ہے۔ لہٰذا یہ اقوام عالم میں سب سے پیچھے ہے۔ جس دن اس نے پھر سے "**یتلوا علیھم ایاتہ**۔ کا پروگرام اپنے سامنے رکھ لیا۔۔۔۔۔ یعنی قرآن خالص کو اپنا نصب العین بنا لیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اقوام عالم کی امامت ان کے حصے میں آ جائے گی۔

کہو سلیم! اب بھی تمہارا یہی خیال ہے کہ اسلام آگے نہیں چلا؟ اسے پھر سمجھ لو کہ (گوئٹے کی تشبیہ کے مطابق) اسلام ایک صاف اور شفاف ندی ہے جو رواں دواں اپنی منزل کی طرف بہہ جا رہی ہے جو قوم اس ندی کے پانی سے اپنی زمین سیراب کرے گی اس کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی۔ تاریخ کے ایک دور میں عرب کی قوم نے ایسا ہی کیا تو اسے "ایک ایک دانے کے عوض سو سو دانے ملے" جب اس نے اس ندی سے پانی لینا بند کر دیا تو اس کی کھیتیاں سوکھ گئیں۔ سطح بیں نگاہوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ وہ ندی ہی سوکھ گئی۔ یہ غلط ہے۔ وہ ندی بدستور بہے جا رہی ہے جس کا جی چاہے اس سے اپنے کھیتوں کو سیراب کر لے۔ **کلا نمد هولاء وهولاء من عطاء ربک۔ وما کان عطاء ربک محظورا۔** (17/20) تیرے نشو و نما دینے والے کا ابر کرم' ہر ایک کو (اس کی سعی و عمل کے مطابق) سیرابی عطا کئے جا رہا ہے۔ اس کی یہ بخشش کبھی نہیں رکتی۔ جوئے رواں کی طرح جاری و ساری رہتی ہے۔

ہست ایں میکدہ و دعوت عام است ایں جا
قسمت بادہ باندازہ جام است ایں جا

مسلمانوں کی کھیتیاں اس لئے سوکھ گئیں کہ انہوں نے اس آسمانی ندی سے آبیاری چھوڑ دی۔ ندی بدستور بہے جا رہی ہے۔ اگر سلیم! تمہارے ریڈیو سے نغمہ نوبہار کی حیات بخش آواز آنی بند ہو گئی ہے تو تمہارے ریڈیو سیٹ میں نقص پیدا ہو گیا ہے خدائی ریڈیو اسٹیشن سے بدستور پروگرام نشر ہو رہا ہے اور نشر ہوتا رہے گا------ **هی حتی مطلع الفجر۔**

قرآن نے اسلامی نظام کی اس خصوصیت کبری کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ سورہ ابراہیم میں ہے **الم تراکیف ضرب الله مثلا کلمته طیبته کشجره طیبته اصلها ثابت و فرعها فی السماء۔** (14/24) "کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے خوشگوار نظریہ حیات کو (کس طرح) مثال دے کر سمجھایا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے بارآور درخت کی سی ہے جس کی جڑ بہت مضبوط ہو اور اس کی شاخیں بلند و فضا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ یعنی اس نظام زندگی کی پہلی خصوصیت یہ ہے

کہ اس کی جڑیں پاتال تک پہنچی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے یہ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ حوادث زمانہ کی آندھیاں اور جھگڑا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ اپنی جگہ مضبوط اور محکم کھڑا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شاخیں فضا کی بلندیوں میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں کسی ایک ملک تک محدود نہیں (دوسرے مقام پر اس کے متعلق کہا کہ لا شرقیتہ ولا غربیتہ۔ (24/25) "یہ مشرق و مغرب کی نسبتوں سے بلند ہے) اس کے بعد ہے توتی اکلھا کل حین باذن ربھا۔ (14/25) قرآنی نظام کا یہ شجر طیب اپنے نشو و نما دینے والے کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اپنا پھل ہر وقت دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی خاص موسم (خاص زمانہ) میں اس نے پھل دیا اور اس کے بعد خشک ہو گیا۔ یہ ہمیشہ پھل دیتا ہے۔ یعنی یہ نظام جہاں مکان (SPACE) کی حدود سے ماوراء ہے وہاں زمان (TIME) کی قیود سے بھی ناآشنا ہے۔

اس حقیقت کو سورہ الرعد میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ مثل الجنتہ التی وعد المتقون۔ تجری تحتھا الانھار۔ جس جنت کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے اس کی مثال (اس باغ کی سی) ہے جس میں ہمیشہ پانی کی ندیاں رواں ہوں اور اس کی وجہ سے اس کے درخت ہر وقت سرسبز و شاداب ہیں اکلھا دائم وظلھا۔ (13/35) اس باغ کے پھل بھی ہمیشہ رہیں اور اس کا سایہ بھی۔

اب ظاہر ہے کہ جس شجر طیب کے متعلق خدا یہ کہتا ہو کہ وہ ہمیشہ پھل دیتا رہے گا اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے ایک زمانہ میں پھل دیا اور پھر خشک ہو گیا' حقیقت کو جھٹلانا ہے (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) جس زمانے کے متعلق سطح بین نگاہیں یہ کہتی ہیں کہ صرف اس میں شجر اسلام نے اپنا پھل دیا تھا اس میں ہوا یہ تھا کہ مومنین کی جماعت نے اپنے حسن عمل کی آبیاری سے اس کی ثمربراری کی رفتار کو تیز کر دیا تھا۔ محمد رسول اللہ والذین معہ۔ (48/29) کی اس سعی و کاوش کے نتیجہ کو بھی قرآن نے کھیتی کی مثال سے سمجھایا ہے جہاں کہا کہ فاستغلظ۔ سو وہ موٹی ہو جاتی ہے۔ فاستوی علی سوقہ۔ پھر وہ اپنی نالوں پر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار۔ (48/29) وہ (اس طرح بارآور ہو کر) کسانوں کے دل کو

خوش کرتی ہے تاکہ ان کی وجہ سے ان لوگوں کو غصہ میں لائے جو اس نظام کی صداقت کا انکار کرتے تھے۔ یعنی جس شجر طیب نے اپنی آفاقی رفتار سے دیر میں جا کر ثمربار ہونا تھا' اس جماعت کی سعی و عمل سے وہ دیکھتے ہی دیکھتے بار آور ہو گیا۔ جب انسانی دست و بازو کی یہ رفاقت ساتھ نہ رہی تو وہ درخت پھر اپنی معمولی رفتار سے بڑھنے' پھولنے اور پھلنے لگا۔

باقی رہی وہ جماعت جس نے اس زمانے میں اس شجر طیب کے شر شیریں سے اس طرح جھولیاں بھرلی تھیں' تو اس کی یہ خوش حالی اس نظام سے پیوستگی کا نتیجہ تھی۔ جب اس نے اس نظام کو چھوڑ دیا تو وہ اس نظام کے ثمرات سے بھی محروم ہو گئی۔ اس کے متعلق سورہ ابراہیم کی اس آیت کے تسلسل میں جسے اوپر درج کیا گیا ہے' قرآن نے کہا ہے کہ یثبت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ۔ و یضل اللہ الظالمین و یفعل اللہ مایشاء۔ (14/27) اللہ جماعت مومنین کی دنیا اور آخرت میں جو جڑیں مضبوط کرتا ہے تو اس نظریہ زندگی کی رو سے ایسا کرتا ہے جو خود محکم اور مضبوط ہے۔ جب تک وہ اس کے ساتھ پیوست رہتی ہے' ثابت اور مستحکم رہتی ہے جب اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تباہ اور برباد ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے وہ نہ کسی کی یونہی ثبات و قرار عطا کرتا ہے نہ بلاسبب کسی کی جڑیں اکھیڑتا ہے۔ جس قسم کا نظام کوئی قوم اختیار کر لیتی ہے اسی قسم کا اس کا انجام ہوتا ہے۔ اسلام نہ کبھی ناکام ثابت ہوا ہے۔ نہ ناکام ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر نظام آخر الامر ناکام رہے گا۔ والعصر۔ زمانہ (کی تاریخ) اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ان الانسان لفی خسر۔ انسان (اپنے خود ساختہ نظامہائے حیات پر چلنے سے) ہمیشہ نقصان میں رہے گا۔ الا الذین امنوا وعملو الصالحات۔ کامیاب ہمیشہ وہ جماعت رہے گی جو نظام خداوندی کی صداقت پر یقین رکھے اور اپنے اعمال صالحہ (سے اس کی ثمرباری کی رفتار کو تیز کر دے) لیکن یہ ہنگامی پروگرام نہیں کہ کسی ایک زمانے میں اس پر عمل پیرا ہو کر وہ قوم ہمیشہ ہمیشہ کے کامیاب و کامران رہے گی خواہ بعد میں اس نظام کو چھوڑ ہی کیوں نہ دے۔ بالکل نہیں۔ وتواصوا بالحق و تواصوا بالصبر (103-13) اس کے لئے ضروری ہو گا کہ اس جماعت کے افراد ایک دوسرے کو اس نظام

حق و صداقت کی تلقین کرتے رہیں اور اس پر ثابت قدمی سے قائم رہنے کی تاکید کریں جب تک مسلمان اس پروگرام پر عمل پیرا رہے قوانین خداوندی کے نتائج حسنہ نے ان کی جھولیاں بھر دیں جب انہوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ ان کے ثمرات سے محروم ہو گئے۔

اور اس کے بعد وہ قوانین اپنی سابقہ رفتار سے آگے چلتے گئے اور چلے جا رہے ہیں!

● ● ●

اس کے آگے چلنے کی ایک زندہ شہادت تو خود پاکستان کا وجود ہے۔ ہم ہزار برس سے "عجمی اسلام" کے زیر اثر یہ مانتے چلے آ رہے تھے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے اسے سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ بیس برس ادھر یہاں یہ آواز بلند ہوئی کہ اسلام ایک معاشرتی نظام ہے جو ایک آزاد مملکت میں ہی قائم ہو سکتا ہے۔ اپنوں بیگانوں نے سب نے اس تصور کی مخالفت کی لیکن آخر اسے کامیابی ہو کر رہی۔

تحریک پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ اسلام میں قومیت دین کی رو سے تشکیل ہوتی ہے۔ وطن کی حدود کے اشتراک کی رو سے نہیں۔ ساری دنیا نے اس تصور کی مخالفت کی حتی کہ عجمی اسلام کے علمبردار حضرات علمائے کرام نے بھی ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔ دس برس تک یہ جنگ جاری رہی اور آخر الامر' ہر ایک کو اس تصور کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس طرح پاکستان وجود میں آ گیا اور اس حقیقت کی زندہ دلیل بن گیا کہ خدا کے اٹل قوانین کی رو سے قومیت آئیڈیالوجی کے اشتراک سے متشکل ہوتی ہے۔ مغربی دنیا جو اپنے ہاں کی قومیت کے غیر قرآنی معیاروں سے بری طرح تنگ آئی ہوئی ہے پاکستان کے تجربہ کو متجسانہ نگاہ سے دیکھ رہی ہے تم دیکھو گے کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد ان خود ساختہ زنجیروں کو توڑ کر کس طرح قرآنی اصولوں کو اپنا لیتی ہے!

تشکیل پاکستان کے بعد یہاں تدوین دستور کا سوال سامنے آیا۔ رجعت پسند عناصر اور عجمی اسلام کے علمبرداروں نے اس میں یہ شق رکھنی چاہی کہ قانون سازی کے ضمن میں امت کے نظام شورائیہ کے اوپر ایک "علماء بورڈ" ہونا چاہیے جس کا فیصلہ حرف آخر ہو گا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے چاہا کہ یہاں اقتدار اعلیٰ "مذہبی پیشوائیت" کو حاصل ہو اور اس

طرح تھیاکریسی کا وہ نظام قائم ہو جائے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ آئین اپنے آخری مراحل میں تھا کہ گورنر جنرل کے ایک فیصلہ سے نہ وہ مجلس دستور ساز باقی رہی نہ اس کا مرتب کردہ دستور!

اس کے بعد یہ فریضہ دوسری مجلس دستور ساز کے سپرد ہوا۔ اس کا مرتب کردہ دستور نقش اول سے قدرے بہتر تھا لیکن اس میں بھی غیر قرآنی عناصر کی کمی نہ تھی۔ اسی سے مذہبی پیشوائیت نے اسے "اسلامی دستور" قرار دے کر جشن مسرت کے شادیانے بجائے تھے۔ لیکن ابھی وہ دستور گھنٹیوں بھی چلنے نہ پایا تھا کہ عسکری انقلاب کے ایک جھکڑ نے اس کے پرخچے اڑا دیئے۔

عسکری انقلاب کا پہلا قدم زرعی اصلاحات تھا جس نے جاگیرداروں اور زمینداروں کے نظام کہن کی بنیادیں ہلا دیں یہ نظام مسلمانوں کے دور ملوکیت میں پیدا ہوا تھا اور عجمی اثرات نے اس پر "عین اسلام" ہونے کی مہر ثبت کی تھی۔ ہماری مذہبی پیشوائیت ہزار برس سے اس کی حفاظت کرتی چلی آ رہی تھی۔ لیکن یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا تھا؟ زرعی اصلاحات نے بڑی بڑی زمینداریوں کی تحدید سے قرآن کے اس عظیم اعلان کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچا دیا جس میں اس نے کہا تھا کہ اولم یروا انا ناتی الارض ننقصھا من اطرافھا۔ (13/41) کیا یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ ہم (کس طرح) زمین کو اس کے بڑے بڑے مرداروں کے ہاتھوں سے کم کرتے چلے جا رہے ہیں؟ واللہ یحکم لا معقب لحکمہ۔ وھو سریع الحساب۔ (13/41) "اللہ (جو) فیصلے کرتا ہے انہیں رد کرنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ جلد حساب لینے والا ہے۔"

عسکری انقلاب کا یہ اقدام قرآنی نظام معیشت کی طرف پہلا قدم ہے جس میں رزق کے مرچشمے عالمگیر نشو و نما کے لئے اسلامی مملکت کی تحویل میں رہتے ہیں۔

تم سلیم! باقی ممالک کے عسکری انقلاب پر نگاہ ڈالو۔ وہ زمانہ تاریک کی آہنی ڈکٹیٹرشپ کی یاد تازہ کر دیں گے۔ لیکن پاکستان میں وہی عسکری انقلاب جس تیزی سے ملک کو آئینی جمہوری کی طرف لے جانے کی تدابیر کر رہا ہے ایسی فضا کی نشان دہی کر رہا ہے جو قرآنی نظام شورائیہ کے لئے بڑی مساعد ہو سکتی ہے۔

ممکن ہے سلیم! ایک عام سیاسی مدبران تبدیلیوں کے اسباب و علل کچھ اور بتائے لیکن میری نگاہ تو مجھ سے صاف صاف کہہ رہی ہے کہ یہ سب کچھ خدا کے اسی کائناتی قانون کے مطابق ہو رہا ہے جو (اپنی غیر محسوس سست رفتاری سے) (کاروان انسانیت کو اس کی منزل کی طرف لئے جا رہا ہے اگر اس کے بعد سلیم! یہاں کا آئین قرآنی خطوط پر مستقل ہو گیا اور اس طرح یہاں قرآنی نظام قائم ہو گیا تو خدا کے یہی قوانین انسانی حساب و شمار سے اپنے نتائج مرتب کرنے شروع کر دیں گے۔ اس کے بعد تم دیکھنا کہ دنیا کس طرح جوق در جوق اس نظام کی طرف آتی ہے۔

لیکن اگر (خدا نکردہ) ایسا نہ ہو اور ہم نے یہاں انسانوں کا خود ساختہ نظام رائج کر دیا تو اسلام کے قوانین پھر اپنی آفاقی رفتار سے آگے بڑھیں گے۔ اور نہ معلوم انسانیت کو انہیں اپنانے میں کتنا عرصہ اور لگ جائے گا۔ اس دور میں جس قدر مزید خونریزیاں اور فساد انگیزیاں ہوں گی ان کے تصور سے بھی روح کانپتی ہے تم سوچو سلیم! کہ اس صورت میں ہم (مسلمان پاکستان) انسانیت کی عدالت میں کس قدر سنگین جرم کے مرتکب قرار پائیں گے۔ لیحملوا اوزارھم کاملتہ یوم القیمتہ ومن اوزار الذین یضلولھم بغیر علم۔ الاساء ما یزرون۔ (16/25) ہماری پشت پر ہمارے جرائم کا بوجھ بھی ہو گا۔ اور ان لوگوں کے جرائم کے بوجھ کا بھی ایک حصہ جو ہماری وجہ سے گمراہ ہوں گے۔ کتنا برا ہو گا یہ بوجھ جو ہم اٹھائے ہوں گے!

بہر حال یہ ہے سلیم! مختصر الفاظ میں اس سوال کا جواب کہ اسلام آگے چلا ہے یا نہیں؟ تمہارا کیا خیال ہے؟ اسلام آگے چلا ہے یا نہیں؟ والسلام

غلام احمد پرویزؒ